Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوائی قلعے

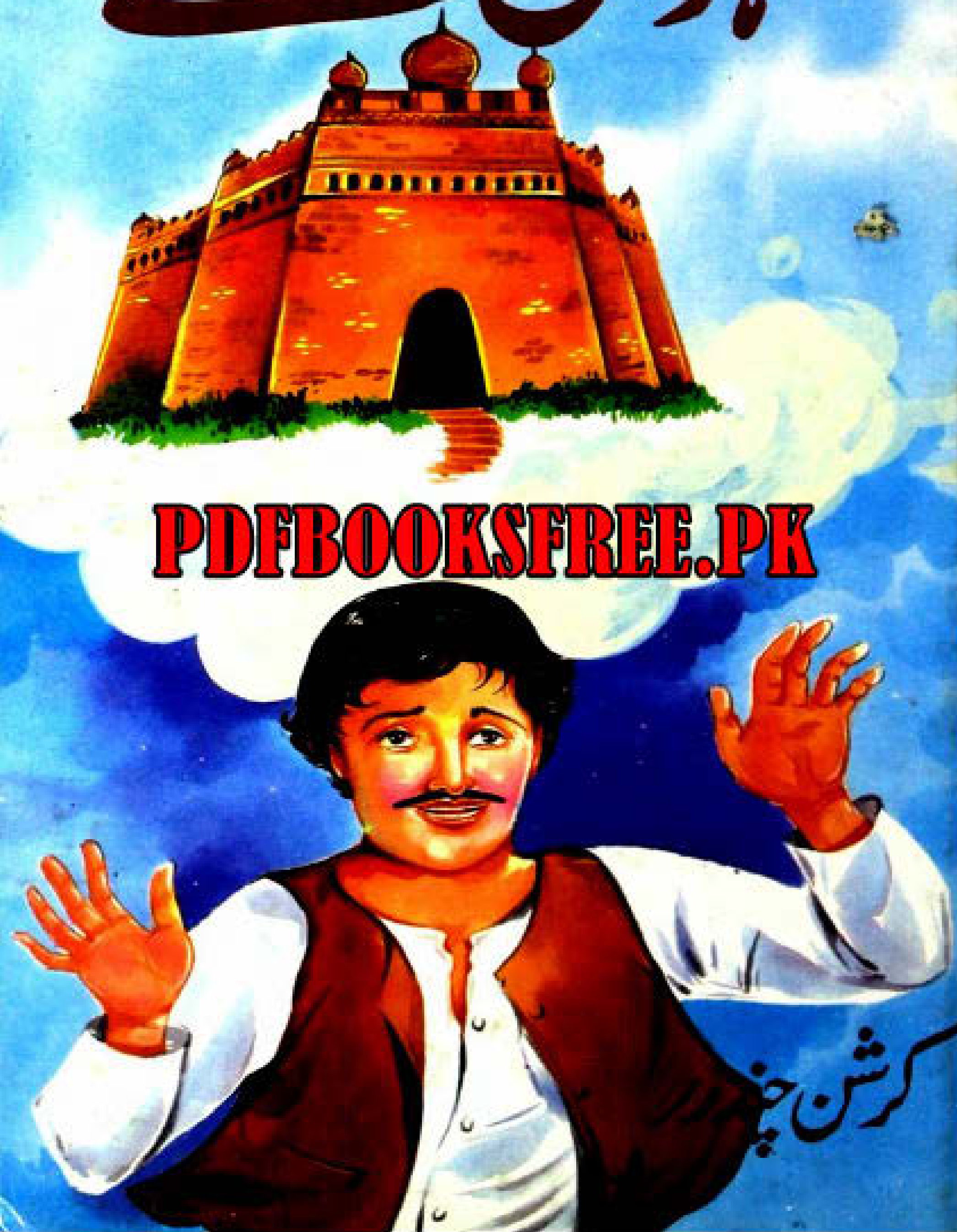

PDFBOOKSFREE.PK

کرشن چندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوائی قلعے

(مزاحیہ اور طنزیہ افسانے)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	ہوائی قلعے
مصنف	کرشن چندر
کتابت	محمد عارف
سن اشاعت	۱۹۹۶ء
مطبوعہ	فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی
قیمت :	۱۲۰/ روپے

پبلیشرز

ایشیا پبلیشرز

اے ۳۶ ۔ چیتک اپارٹمنٹس

پلاٹ نمبر ۲/۲۷ ۔ سیکٹر ۹

روہنی دہلی ۸۵

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوائی قلعے

کرشن چندر

M/s Asia Publishers
A-36 Chetak Appt.,
Plot No:27/2
Sector 9 Rohini,
Delhi-85
T.No: 7261823

HAWAI KILEY
Krishan Chander
Price- Rs.120/-

۱۔ کوپن
۲۔ دیباچہ نگاری
۳۔ یوگا
۴۔ ردّی
۵۔ بے بال وپر
۶۔ ایک وحشی بمبئی میں
۷۔ اخباری جوتشی
۸۔ چلتا پُرزہ
۹۔ غلط فہمی
۱۰۔ گانا
۱۱۔ جان پہچان
۱۲۔ غسلیات
۱۳۔ بدصورتی
۱۴۔ رونا
۱۵۔ بیچلر آف آرٹس
۱۶۔ شادی
۱۷۔ عشق اور ایک کار
۱۸۔ الف لیلہ کی گیارھویں رات
۱۹۔ آنکھیں
۲۰۔ کسان اور دیوتا
۲۱۔ ہوائی قلعے

☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوپن

اپنے ہاں جو سلام بھائی رہتے ہیں نا۔ انھیں کوپن جمع کرنے کا بہت شوق ہے مذہب کے بعد اگر ان کا ایمان کہیں ہے تو کوپنوں میں، ابھی چند روز کا ذکر ہے میں نے سلام بھائی کے ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ سگریٹ کی ڈبیہ دیکھی۔ میں نے سوچا کہیں یہ کوپنوں کے شوق میں پراٹھوں کے ساتھ سگریٹ تو نہیں کھانے لگ پڑے اس لیے ان سے فوراً ہی گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ماجرا ہے۔؟ ناشتے کے پلیٹ میں سگریٹ کی ڈبیہ کیسی۔؟"

سلام بھائی نے ڈبیہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ سگریٹ کی ڈبیہ نہیں ہے مکھن کی ڈبیہ ہے۔"

بیسوی صدی میں صنعتی اشیاء کی پیکنگ اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے کہ مکھن کی ڈبیہ سگریٹ کی ڈبیہ نظر آتی ہے کھلونے بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اور عورتیں بالکل مصنوعی بلکہ اکثر ان پلاسٹک کی عورتوں میں جو وایٹ وے کی نمائشی کھڑکی میں ریان کی جرابیں پہنے نظر آتی ہیں۔ ہماری اصلی چلتی پھرتی خواتین سے زیادہ زندگی اور جاذبیت نظر آتی ہے کوپن بھی صنعتی دور کا اعجاز ہے اور سلام بھائی اس کے بے حد قائل ہیں۔

میں نے سلام بھائی سے پوچھا۔ "آپ ناشتے کے وقت ہر روز ایک نئی ڈبیہ لاتے ہیں۔؟"

سلام بھائی بولے۔ "میں اس کے کوپن جمع کر رہا ہوں۔"

"کوپن جمع کرکے کیا ہوگا۔؟"

سلام بھائی بولے۔ "کوپنوں سے بہت سی اشیاء مُفت ملتی ہیں۔"

"مُفت! نہیں بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔؟"

"ہاں بالکل مُفت، مثال کے طور پر اگر آپ کے پاس اس مکھن کی ڈبیہ کے پانسو کوپن ہوں تو آپ ایک ہری کین لالٹین حاصل کرسکتے ہیں۔"

"لالٹین لے کر میں کیا کروں گا۔؟ آج کل تو بجلی کا زمانہ ہے۔"

"اچھا لالٹین نہ سہی کچھ اور سہی۔ فہرست میں بہت سے اشیاء کے نام ہیں۔"

"لالٹین ہے۔" سلام بھائی نے فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "سگریٹ جلانے کا چاندی کا لائیٹر ہے۔ کوی کا جوتا ہے۔ ریان کی جراب۔ کوئی روز کے دس قبضے"

"میں کوئی روز کا استعمال نہیں کرتا۔ گو کالجوں میں اکثر لونڈے آج کل میک اپ کے اعتبار سے لڑکیوں سے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ پھر بھی سلام بھائی یہ فضول خرچی ہے۔ آخر پانسو کوپن جمع کرنے میں تو روپیہ خرچ ہوتا ہے نا۔"

سلام بھائی بولے۔ "آپ بھی تو غضب کرتے ہیں۔ مکھن تو روزمرہ کے استعمال کی شے ہے۔ آپ مکھن خریدتے ہیں۔ ساتھ میں کوپن مُفت ملتا ہے۔ پانسو کوپن اس طرح اکٹھے ہوجائیں تو ہری کین لالٹین، ایک ہزار ہوں تو پارکر کا فونٹن پن، دس ہزار ہوں تو ریڈیوگرام ہولیے۔"

میں قائل ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ "مکھن کی ڈبیہ جس میں کوپن ہوتا ہے۔ کتنے میں آتی ہے۔؟"

"ساڑھے گیارہ آنے میں۔"

دوسرے روز میں نے بھی ڈبیہ خریدی۔ مجھے ریڈیوگرام لینے کا شوق تھا۔ اس لیے میں نے دن میں چار بار یہ ڈبیہ خریدنی شروع کی۔ مجھے مکھن پسند نہیں ہے۔ میں دراصل دہی پسند کرتا ہوں۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ مکھن خریدتا تھا۔ کیوں کہ ریڈیوگرام لینا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ روز چار چھ ڈبیہ خریدتا اور مکھن کھانے کی کوشش کرتا اور اکثر ناکام رہتا۔ اس لیے کوپن اُٹھا کر جیب میں ڈال لیتا اور مکھن سلام بھائی کو دے دیتا۔ اس پر وہ بہت ناک بھوں چڑھاتے کہتے ۔آپ مکھن رکھ لیجیے۔ کوپن ہمیں دے دیجیے۔ میں نے کہا۔ وہ مجھے تو ریڈیو گرام لینا ہے۔ اسی لیے تو مکھن کھا رہا ہے۔ آپ بھی کھائیے۔ چنانچہ میں نے زبردستی گھر میں سب کو مکھن کھلانا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مکھن کی افراط سے پیچش ہوگئی۔ اور شفا ہوتے ہوتے ڈیڑھ سو روپے اُٹھ گئے۔ اب تک میرے پاس دو سو کوپن جمع ہوگئے تھے۔ میں نے سوچا ریڈیو گرام تو کہاں آئے گا چلو ان دو سو کوپنوں کا جو مل جائے لے لیں۔ میں دو سو کوپن لے کر گیا۔ انھوں نے کہا۔ ان اشیا میں سے کوئی ایک چیز اپنے لیے پسند کرلیں۔

اشیا یہ تھیں۔

۱۔ کاٹھ کا گھوڑا چھ سال کے بچے کی سواری کے لیے۔
۲۔ بالوں کے پنوں کے تین سیٹ۔
۳۔ لپ اسٹک۔
۴۔ بالوں کو گھنگھریالے بنانے کا آلہ۔
۵۔ پھلوں کا رس نکالنے کی مشین۔
۶۔ آئس کریم کھانے کا خوشنما پلاسٹک چمچہ۔

پہلے تو سوچتا رہا۔ ان میں سے تو ایک چیز بھی اپنے کام کی نہیں۔ آخر آئس کریم کھانے پر جی آگیا۔ میں نے پلاسٹک کا چمچہ اٹھا لیا۔ اور ریستوران میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ وہاں میں نے اس خوبصورت چمچے سے چھ پلیٹیں خوب ڈٹ کے کھائیں۔ لیکن جب بل آیا کیا دیکھتا ہوں کہ پلیٹ میں بل کے ساتھ ایک کوپن بھی دھرا ہے۔

"میں نے گھبرا کر پوچھا۔" یہ کیا ہے۔؟"

ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔" اپنے ہاں جو چھ پلیٹ آئس کریم اکدم کھائے اسے ایک کوپن ملتا ہے۔"

"میں اس کوپن کو لے کر کیا کروں گا؟ نہ بابا میں باز آیا یہ کوپن اُٹھاؤ۔"

ویٹر نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔" آپ اسے لے جائیے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ کو مفت میں مل رہا ہے۔ آپ کسی دوست کو دے ڈالیے گا۔ وہ آپ کا ہمیشہ احسان مند رہے گا۔"

"اجی صاحب" ویٹر نے ایک لمبی فہرست کھولتے ہوئے کہا۔" اگر آپ کے ایک درجن ایسے کوپن ہوں تو ہم آپ کو گریٹا گاربو کی فریم کردہ خوب صورت تصویر دیں گے۔"

"چوبیس کوپن ہوں تو بال اگانے کی کریم"

"مگر میں گنجا نہیں ہوں۔"

"پچاس کوپن ہوں۔ تو بایو کیمسٹری کے ایک چرمی بیگ بند مکمل دواخانہ۔"

"کاہے کے لیے بھائی۔؟"

"بدہضمی دور کرنے کے لیے۔ ہر قسم کی بیماری کے علاج کے لیے۔"

"پانسو کوپن ہوں تو ایک دو سیٹ کی چھوٹی موٹر گاڑی۔"

"باپ رے!" میں اُچھل پڑا۔" لاؤ۔ لاؤ ادھر لاؤ یہ کوپن ــــ" کوپن لے کر اس دن کے بعد میں نے وہاں سے آئس کریم کھانی شروع کر دی۔ دو مہینے ہی میں تین سو کوپن جمع کر لیے۔ اگلے ماہ پچاس اور بڑھ گئے۔ لیکن اب مجھ سے آئس کریم کھائی نہ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ میں آئس کریم نہیں کوپن کھا رہا ہوں۔ یا آنے والی کار کے پرزے چبا رہا ہوں۔ پھر پچاس کوپن اور بڑھ گئے۔ یہ کوپن بڑی مشکل سے کھائے گئے۔ میرا مطلب ہے۔ آئس کریم بڑی مشکل سے چبائی گئی۔ روز رات کو کھٹی ڈکاریں آتیں۔ زکام ہو جاتا۔ دوسرے احباب بہتیرا سمجھاتے۔ مگر مجھ پر تو ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح پانسو کوپن پورے ہو جائیں۔ اور اب تو صرف ایک سو کوپن باقی رہ گئے تھے۔ جب پانسو میں صرف پچیس کوپن باقی رہ گئے تو شام کے وقت مجھے کچھ حرارت سی ہوگئی۔ رات کو میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے ہوش ہو گیا۔ صبح کو ملک عدم سدھارا جاتا اگر عین وقت پر طبی امداد نہ طلب کر لی جاتی معلوم ہوا زیادہ آئس کریم کھانے سے میرے پھیپھڑوں کی جھلی میں ورم پڑ گیا ہے۔ دو مہینے علاج ہوتا رہا۔ ڈیڑھ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ خیر جب اچھا ہوا تو کوپن اٹھا کر دوکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا انعام یا تو چار سو کوپن پر ملتا ہے یا پانسو کوپن پر۔ چار سو پچھتر کوپن پر کچھ نہیں ملے گا۔

"تو چار سو کوپن پر ہی کچھ دے دیجیے۔"

"یہ دیکھیے فہرست۔"

"میں نے دیکھی فہرست آپ بھی دیکھ لیجیے۔"

۱۔ کوٹ ٹانگنے کی کھونٹیاں چوبیس۔

۲۔ سوٹ پریس کرنے کی مشینیں دو۔

۳۔ بجلی سے حجامت کرنے کی مشینیں دو۔

۴۔ ریان کی جرابیں چار عدد۔

۵۔ مغربی عورت کے سر پہ پہننے کی ہیٹ۔

۶۔ اونچی ایڑی کے سینڈل دو۔

۷۔ اصلی برائر کی لکڑی کا پائپ۔ نقرئی ہینڈل کے ساتھ۔

میں نے پوچھا۔ "چار سو پچھتر کوپنوں میں کار نہیں دو گے۔؟"

"نہیں وہ تو پانسو کوپنوں میں آتی ہے۔ آپ پچیس کوپن اور جمع کر لیجیے۔ اس میں ہے کیا۔؟"

"ہے کیا!" میں نے گرج کر کہا۔ "میرے پھیپھڑوں کی جھلی پر ورم آ گیا ہے آئس کریم کھاتے کھاتے، اور تم پچیس کوپن کی رعایت نہ کر سکے۔"

"ہمیں بڑا افسوس ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم ان پچیس کوپنوں کے عوض میں اس کار کا ہڈ اتار لو۔ اس کے آگے کی دو بتیاں غائب کر دو۔ یا ایک ٹائر پنکچر کر دو۔ اس کا اسٹیرنگ وہیل

توڑ دو۔ مگر للہ مجھے وہ کار ضرور دے دو۔ یہ دیکھو میرے پھیپھڑوں میں ورم آ گیا ہے تمھاری آئس کریم کھاتے کھاتے۔"

وہ انکار کرتا گیا۔

میں نے کہا۔ "اگر تو پھر اس فہرست میں مجھے اپنے لیے اونچی ایڑی کا سینڈل چاہیے۔ مگر یہ شرط ہے میرے پاؤں پر فٹ آ جائے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

"یہ میں نہیں جانتا تمھیں فٹ کرنا ہو گا۔ نہیں تو مجھے ایک مغربی عورت کی ہیٹ دے دو۔ میں اسے پہن کر تمھارے ریستوران کے سامنے ناچا کروں گا۔ اس علالت کے دوران میری نوکری بھی چھن گئی ہے۔ تم سے بھیک مانگ کر کھانا کھایا کروں گا۔"

وہ ہنسا۔ "آپ بڑے زندہ دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ برائر لکڑی کا پائپ لے جائیے۔ کس قدر خوشنما شے ہے۔"

"مگر میں تمباکو نہیں پیتا۔"

"مگر تمباکو بھی تو دیجیے۔" میں نے پائپ لے کر کہا۔

"ہم تو صرف پائپ دیتے ہیں۔ ساری SORRY!"

وہ بولا۔ "تمباکو آپ کسی تمباکو فروش سے لے لیجیے۔"

پائپ لے کر میں تمباکو فروش کی دوکان پر پہنچا۔ وہاں سے ریٹ سکوائر کے دو ڈبے خریدے خوبصورت خوشبودار تمباکو ہے۔ دس روپے میں دو ڈبے ملے۔ اور ساتھ میں ایک کوپن۔

"نہیں نہیں۔" میں نے چلا کر کہا۔ میں یہ کوپن نہیں لوں گا۔ ابھی تو میرے پھیپھڑوں میں ورم ہے۔ اب کیا چاہتے ہو۔ کہ میری آنتیں بھی گل جائیں۔ اللہ جانے یہ کوپنوں کی وبا کب ختم ہو گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوکاندار بولا۔ "دو ڈبوں کے ساتھ ایک کوپن ملتا ہے...... چار ڈبوں کے ساتھ چھ کوپن اور جب چھ کوپن سے اوپر ہوجائیں تو ہماری انعامی فہرست شروع ہوجاتی ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ چلا کر کہا۔ "میں نہیں دیکھوں گا یہ فہرست۔"

دوکاندار نے فہرست اونچی آواز میں پڑھ کر سُنانی شروع کی۔ "فرنچ موتیوں کی مالا۔ گولڈ فش رکھنے کا قیمتی حوض اعلیٰ کاپیرر کی گرم ٹوپی۔ چائے کا سٹ۔ کراؤن مارکہ۔ سامان برتھ کنٹرول اپوڈیٹ۔ بال اڑانے کی کریم۔ شارک سکن کا مردانہ سوٹ۔ ریفریجریٹر۔"

"ریفریجریٹر۔؟" میں نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میرے امیر دوستوں کے ہاں کیسے خوبصورت ریفریجریٹر ہیں۔ ہر چیز برف کی طرح ٹھنڈی ملتی ہے۔ شفاف اور خنک۔ گرمیوں میں کھانے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کتنے کوپنوں میں ملتا ہے۔!" میری آواز کانپ رہی تھی۔

"صرف پانچ ہزار کوپن میں۔"

"یعنی کتنا تمباکو پینا پڑے گا مجھے؟"

"بیس ہزار ڈبے ایک سال میں خریدیئے۔ ایک سال میں کوپن بے کار ہوجاتے ہیں۔"

"بیس ہزار ڈبے۔ یعنی کتنا تمباکو ہوا جی۔؟"

"دو ٹن۔"

"دو ٹن تمباکو پی کر آپ کا کیا خیال ہے۔ میں زندہ رہ سکوں گا۔"

"کوشش کیجیے۔"

پھر وہ رک کر بولا۔ "ایک صاحب پچھلے سال ہی ریفریجریٹر حاصل کرچکے ہیں۔" پھر وہ رک کر افسردہ لہجہ میں بولا۔ "ریفریجریٹر حاصل کرنے کے دوسرے ہی دن وہ چل بسے تھے۔ انھیں تپ دق ہوگئی تھی۔ آہ بے چارا بڑا اچھا گاہک تھا ہمارا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "یہ کوپن تم رکھ لو جی۔"

"یہ کوپن تو واپس نہیں ہوسکتا۔ مگر ایک بات کہتا ہوں۔" دوکاندار بولا۔ "آپ اسے رکھ لیجیے۔ آپ چھ کوپن حاصل کرلیجیے۔ چھ کوپن میں ہم آپ کو نیو پلازہ سینما کا ایک ٹکٹ دے دیتے ہیں۔ آپ پکچر دیکھنے جائیے۔"

"مگر میرا آج کا پروگرام پکچر کا نہیں ہے۔ دوسرے اگر مجھے پکچر پسند نہ آئی تو۔ یعنی میں پکچر دیکھنا ہی نہیں چاہتا آج۔"

"تو کیا مضائقہ ہے۔ آپ کے کون سے پیسے خرچ ہوں گے۔ اس پر مزے میں بیٹھ کر پکچر دیکھیے۔ اچھا نہ دیکھیے۔ سیٹ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیجیے۔ اور آرام سے آہستہ آہستہ ناک کے نتھنوں سے ہمارے بہترین تمباکو ریٹ اسکوائر کا دھواں نکالیے۔ زندگی میں اس سے بہتر سکون کہیں نہیں ملے گا اور۔"

سکون و آرام، ذہنی تعیش کی کس قدر خوبصورت تصویر کھینچی ہے ظالم نے۔ میں قائل ہوگیا۔ فوراً چھ کوپنوں کے لیے تمباکو کے ڈبے خرید لیے اور پھر نیو پلازہ کا ٹکٹ حاصل کرکے سینما پہنچ گیا۔ سینما کے دروازے پر فرسٹ کے درجے کے سامنے ایک باوردی ملازم نے میرا ٹکٹ مجھ سے لیا۔ آدھا ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا اور آدھا مجھے واپس کردیا۔ اور ساتھ ہی ایک کوپن دیا۔

"ہائیں!" میں فرش سے دو فٹ اونچا اچھلا۔ "یہاں بھی کوپن ہے۔ یا اللہ یہ کیا مصیبت ہے۔؟"

باوردی ملازم مسکرایا۔ اور اس نے آہستہ سے سامنے دیوار پر ایک بڑے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کیا میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"نہیں نہیں میں نہیں دیکھوں گا۔ اب چاہے کچھ بھی ہوجائے۔"

وہ بولا۔ "اس سے بہتر فرسٹ ہمارے ملک کی کسی انڈسٹری میں نہیں ملے گی یہاں کوپنوں کے عوض بوسے ملتے ہیں۔"

"بوسے؟" میں چیخا۔ "کیا کہتے ہو۔؟" میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"آپ نوٹس بورڈ پر پڑھیے" وہ بولا۔

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ لڑکھڑاتا ہوا دیوار پر لگے ہوئے چوکھٹے کے قریب گیا وہاں بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔

انعامی فہرست

یہاں کوپنوں کے عوض بوسے ملتے ہیں۔ کھیل دیکھیے اور بوسے حاصل کیجیے۔ جن اداکاروں کے بوسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

بیگم چٹخارہ	پانسو کوپن
مس ستیاناس بتیا	دو ہزار کوپن
مس پھریا	ایک لاکھ کوپن
بی بی نور آسمانی	پچاس ہزار کوپن
بی بی کرگس	دو لاکھ کوپن
عندلیب کمار	دس ہزار کوپن
اشوک کمار	تین لاکھ کوپن

منظور شدہ بیو بورڈ آف سنسر۔ جے ہند

لمبی چوڑی فہرست تھی۔ خیر حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ اشوک کمار کا ریٹ بہت اونچا تھا۔ یعنی بی بی کرگس سے بھی اونچا۔

میں نے باوردی ملازم سے پوچھا۔ "یہ کیا معاملہ ہے۔؟"

وہ بولا۔ "اجی صاحب کیا بتاؤں۔ لڑکیاں تو اس قدر فدا ہیں اشوک کمار پر کیا بتائیں صاحب کہ ہر ہاؤس لڑکیوں سے بھر جاتا ہے۔ سبھی اشلوک کمار کا بوسہ لینا چاہتی ہیں۔ جسے دیکھیے وہی گھائل ہے۔"

"غلط ہے" میں نے گرج کر کہا۔ "ہم لوگ ہندوستانی ہیں رشیوں منیوں کی اولاد ہیں۔ روحانیت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ ہماری لڑکیاں اتنی بے حیا نہیں

ہوسکتیں۔"

"دل کا حال تو وہی جانتا ہے" ملازم نے کہا۔ "ہاں مگر اپنے سینما ہال میں آپ اندر جا کے تو دیکھیے اسی فیصدی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ سب کی سب اشلوک کمار کی متلاشی سنتا ہوں۔ وہ بے چارہ بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"وہ کیوں۔؟"

"یہ بھی ایک راز ہے۔ خیر آپ کو بتاتا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

"شش۔ کبھی نہیں" میں نے دونوں کان پکڑے اور پھر اپنے گال پر تھپڑ مار کر کہا۔ "مر جاؤں گا مگر اس فلم انڈسٹری کے راز کو کبھی افشا نہیں کروں گا۔"

"ایک بڈھی پارسی خاتون ہے وہ اشلوک کمار پر...... آپ...... سمجھ گئے نا؟ ریجھ گئی ہے۔ بڑی دولت مند بڑھیا ہے۔ خراسان جی، خراسان جی خچر والے کی بیوہ۔؟"

"ارے جب تو کروڑوں کی مالک ہے وہ۔!"

"آپ جانیے اسے پیسوں کی کیا کمی۔ اس نے ایک سال کے لیے ساتھ والا سینما بک کرا لیا ہے تاکہ سارے کوپن خود حاصل کر کے جلد سے جلد اشلوک کمار کا بوسہ لے سکے۔ اسی طرح کئی ایک بڑے بڑے مارواڑی اور گجراتی سٹے بازوں نے سینما ہاؤس بک کر لیے ہیں۔ اور دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں۔ کوئی کسی اداکار کے لیے کوئی کسی کے لیے۔"

"جب تو خوب سلور اور گولڈن جوبلیاں منائی جاتی ہوں گی۔؟"

"کچھ نہ پوچھیے۔ بس ہاؤس فل ہیں۔ فل جا رہے ہیں۔ فل جائیں گے۔ عجب زندگی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اچھا زیادہ تر تو یہ لوگ بے بی کرگس، مس پھریا، یا مس چٹخارہ کے کوپن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں صاحب۔"

"ارے! نہیں کیوں؟ میرا تو خیال ہے......"

"آپ کا خیال غلط ہے۔" وہ بولا۔ "آج کل مس مصیبتا دیوی اور کوکیلا رانی بڑا رش لے رہی ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میرے خیال میں ان کا زمانہ تو لد چکا ہے۔ اور پھر اس فہرست میں" میں نے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان کا نام بھی نہیں ہے۔"

"اس لیے تو وہ بوسوں کے علاوہ کوپن بھی خود اپنے پاس سے دیتی ہیں۔"

"کوپن اپنے پاس سے دیتی ہیں! کیا کہتے ہو تم؟"

"ہاں اور یار لوگ دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں تاکہ......"

"تاکہ.... میں نے ایک دم خوش ہو کر کہا۔ "ایک لاکھ کوپن اکٹھے ہو جائیں تو مس پھر یا......"

"اور دو لاکھ ہو جائیں۔" اس نے جواب دیا۔ تو بے بی نرگس۔ اسی لیے تو صاحب وہاں پر نائی، دھوبی، کنجڑا اور آپ ایسا بے کار فلمی ادیب بھاگم بھاگ...... "میں نے مٹھائیاں کس لیں اور بھاگنا شروع کر دیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟ فرسٹ کلاس ادھر ہے ارے کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"کوکیلا رانی کے پاس۔" میں نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔ اور سینما ہال کے باہر نکل آیا۔

ہندوستان کے صنعتی دور میں اب تو سب کچھ کوپن سے ملنے لگا ہے۔ غذا، محبوب، نوکری، شہرت، گھر سب کچھ کوپن سے ملتا ہے۔ اور نہیں کہیں ملتا ہے تو روح کا کوپن۔ شرافت کی طرح وہ ہر جگہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

☆☆

دیباچہ نگاری

جن دنوں میں افسانے لکھا کرتا تھا، افسانہ نگاری کو ادب کی تمام اصناف میں سے مشکل ترین سمجھا جاتا تھا۔ اور دیباچہ اور دیباچہ نگاری کے متعلق تو میرا یہ خیال تھا کہ یہ ایک سہل ترین ادبی مشغلہ ہے۔ ارضی اور سماوی حقیقتوں کے ساتھ خارجی اور داخلی تخیل کے فانڈے ملاؤ اور ان میں فرئیڈ، جیمس جائس اور اوڈی پس کمپلکس کی آمیزش کرو اس کے بعد تکنیک فن کار اور بیج، جیسے الفاظ کا بار بار ذکر کرو۔ پس دیباچہ تیار ہے۔ اسی خیال کے تحت میں دیباچہ نگاروں کو "ادبی مُفت خورے۔" کہا کرتا تھا۔ اور میرے ذہن میں ان کی ادبی حیثیت وہی تھی۔ جو میونسپل لائبریریوں سے رسالے چرا کر پڑھنے والوں کی ہے بلکہ تھی۔ (کیوں کہ اب تو میں میونسپل لائبریریوں سے اخبار اور رسالے چرانے کے کام کو بھی فنونِ لطیفہ میں شمار کرتا ہوں!)

اب کچھ دنوں سے میری توجہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر دیباچہ نگاری کی طرف مائل ہوتی ہے اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں بلکہ میرے خیال میں تو افسانہ لکھنا دیباچہ لکھنے سے کہیں سہل ہے۔ افسانے میں مصنف اپنے جذبات سے جس طرح چاہیے کھیل سکتا ہے۔ جس طرح چاہے واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اگر ہیرو سے ناراض ہو جائے تو اسے خودکشی پر مجبور کر سکتا ہے۔ اسے زہر دے سکتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے پھینک سکتا ہے۔ لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر دیباچہ لکھ رہے ہیں تو آپ صاحب کتاب کو کسی ایسی بات کے لیے مجبور نہیں کرسکتے۔ آپ اس کی لکھی ہوئی عبارت کا ایک لفظ بھی نہیں بدل سکتے۔ آپ اپنا افسانہ جب چاہے پھاڑ ڈالیے۔ لیکن دیباچہ والی کتاب سے آپ ایسا سلوک کبھی نہیں کرسکتے۔ یہ دیباچہ نگاری کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس سے صاحب کتاب کی دل شکنی ہوتی ہے۔ پھر اس ملک میں جہاں لوگ سانپوں کو بھی دودھ پلاتے ہیں۔ اس قسم کا تشدد کیسے روا رکھا جاسکتا ہے۔

جوں جوں میں دیباچہ نگاری کے فن کا مطالعہ کرتا ہوں مجھے یہ ایک بحر ذخار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی طرح دیباچہ نگاری کی ابتدا اور انتہا معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت اور گہرائی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ادب کے سمندر میں جس گوہر بے بہا کی مجھے تلاش ہے وہ مجھے یہیں سے حاصل ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکر اور ادیب وہ لوگ ہیں جنھوں نے عمر بھر دیباچے لکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا تو میں اور بھی انہماک سے دیباچہ لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ آپ لاکھ اچھے شاعر ہوں، افسانہ نگار ہوں ناول نگار ہوں اور ڈراماٹسٹ ہوں۔ آپ کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ لیکن آپ اگر ایک عدد دیباچہ لکھ دیں تو دنیا ادب میں آپ کا نام ستارے کی طرح چمک اٹھے گا۔ ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ سے ملنے، بات کرنے اور اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوانے کے لیے کوشاں ہوگا۔

لیڈری کے بعد دیباچہ نگاری ہی ایک ایسا فن ہے جس سے آدمی ہندوستان میں ابدی شہرت حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس کے لیے نہ کسی کوشش کی ضرورت ہے۔ نہ کاوش کی۔

شہرت کے علاوہ دیباچہ نگاری کے اور کئی فائدے ہیں مثلاً یہ کہ صاحب کتاب سے آپ کے ذاتی مراسم ہمیشہ کے لیے استوار ہوجاتے ہیں۔ اور وہ عمر بھر آپ کا احسان مند رہتا ہے۔ کبھی کسی مجلس میں آپ کے خلاف وہ ایک

لفظ تک نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ اس کی کتاب پر آپ نے دیباچہ لکھا ہے۔ سب لوگ اس امر سے واقف ہیں۔ اگر آپ کے خلاف کچھ کہتا ہے تو یار لوگ اس کے فطری کمینہ پن پر محمول کریں گے اس لیے بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے دوستوں کی بجائے دشمنوں کی کتابوں پر دیباچہ لکھنا زیادہ سود مند ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا گر ہے جسے بہت کم دیباچہ نگار جانتے ہیں۔ لیکن جس کی افادیت آج سے مسلم سمجھی جانی چاہیئے۔

دیباچہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس سلسلے میں بعض دیباچے ایسے عمدہ ہوتے ہیں کہ انھیں پڑھ کر کتاب پڑھنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اور میرے خیال میں تو ایک اچھے دیباچہ نگار کا بھی نصب العین ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے معیاری دیباچہ بہت کم لکھے جاتے ہیں اور اگر لکھے بھی جائیں تو کبھی کبھی صاحب کتاب انھیں کتاب میں شامل کرنے سے انکار بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا خطرہ ہے جسے ہر ایک دیباچہ نگار کو بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ اس طرح دیباچہ نگار نہ صرف اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دیتا ہے بلکہ رفاہِ عام کا کام بھی کرتا ہے۔ آج کا زمانہ پیکار اور کش مکش کا ہے۔ بقائے حیات کے لیے لوگوں کو اتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے کہ وہ ادبی مصروفیتوں کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے وہ ناول چھوڑ کر افسانے پڑھتے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے کے بجائے سینما دیکھتے ہیں۔ اخبار دیکھنے کے بدلے ریڈیو سنتے ہیں۔ اور اب وہ دن بھی دور نہیں کہ جب کتاب پڑھنے کے بجائے صرف اس کا دیباچہ پڑھا کریںگے۔

دیباچے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لکھے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نہیں لکھے جاتے۔ دوسری قسم میں وہ دیباچے شامل ہیں۔ جہاں صاحب کتاب اپنی طرف سے دیباچہ میں دیباچہ نگار کا نام اس سے پوچھے بغیر دے دیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب کو جو ضلع کیمل پور میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درزی ہیں اپنے غیر مطبوعہ افسانوں کے لیے ایک دیباچہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے جھٹ سے اپنے ایک دوست کو خط دیا جو بدقسمتی سے دیباچہ نگار کا بھی دوست تھا کہ وہ اپنے دیباچہ نگار دوست سے ایک عدد دیباچہ لکھوا کر بھیج دے۔ دیباچہ نگار کے دوست نے کچھ کہے سنے بغیر ہی اپنے دوست کو لکھ دیا کہ وہ خود ہی ایک دیباچہ تیار کرے اور اس میں جو جی چاہے لکھ ڈالے اور اس پر دیباچہ نگار کا نام دے دے خیریت یہ ہوئی کہ عین وقت پر سب حال معلوم ہوگیا اور اس نے خود ایک دیباچہ لکھ کر پیچھا چھڑایا۔ خیر یہ تو ایک اتفاق تھا۔ ورنہ عموماً ان حالتوں میں یہ ہوتا ہے کہ دیباچہ نگار کو اپنے دیباچہ کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب کتاب چھپ کر اس کے پاس پہنچ جاتی ہے اور جب وہ اپنے دیباچہ میں یہ فقرے پڑھتا ہے۔

"جناب شیام کیمبل پوری کے افسانے درد، یاس اور غم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ افسانوی نقطۂ نگاہ سے وہ ہمیں منشی پریم چند کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔" تو دیباچہ نگار کا اپنا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے سینے میں جو درد اٹھتا ہے اور جس طرح اس کے دل پر یاس اور غم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ اچھی طرح سے کر سکتے ہیں جو جعلی دستخط بنانے میں ماہر ہوں یا جن کا روپیہ بینک سے جعلی دستخط بنانے والے نے ہتھیا لیا ہو۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ دیباچہ نگار اور صاحب کتاب دو مختلف افراد ہیں۔ لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ صاحب کتاب ہی خود اپنا دیباچہ نگار ہوتا ہے: من تو شدم تو من شدی یہ وہ عرفانی مقام ہے جہاں ساری دوئی مٹ جاتی ہے اور کتاب دیباچے میں اور دیباچہ کتاب میں مدغم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے اس کا حوصلہ وہی ادیب کر سکتے ہیں جو معرفت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ کئی ترقی پسند

صوفی منش ادیبوں کو بھی اس قسم کا ادبی نروان حاصل ہو چکا ہے۔

دیباچے عموماً دو طرح کے لکھے جاتے ہیں۔

(۱) کتاب پڑھ کر۔

(۲) کتاب پہلا طریقہ صرف عطائی اور مبتدی دیباچے نگار عمل میں لاتے ہیں۔ جو تجربہ کار کہنہ مشق دیباچہ نگار ہیں وہ کبھی کتاب نہیں پڑھتے، بلکہ اکثر کتاب کے نام مصنف کے اسم گرامی اور نفس مضمون سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ کتاب اور دیباچہ میں جتنا بعد ہوگا، دیباچہ اتنا ہی عمدہ ہوگا۔ اور کتاب اور دیباچہ میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو اسے دیباچہ نگاری کی معراج سمجھیے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اردو ادب میں اس قسم کی دیباچہ نگاری کی کئی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ اور ادب کی کسی اور صنف میں نہ سہی، کم از کم اس صنف میں تو یقیناً ہم مغربی ادب سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ جیسا کہ میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں ایک اچھے دیباچے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کا کتاب کے نفس مضمون سے کوئی تعلق ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو چندر بھان اگنی ہوتری کی نئی مثنوی "رفعتِ خیال پر دیباچہ لکھنا ہے تو آپ اسے اس طرح شروع کر سکتے ہیں۔

"میں مسوری میں اپنی کوٹھی "الہلال میں بیٹھا ہوا۔ اپنی ننھی لڑکی نجمہ سے باتیں کر رہا تھا۔ نجمہ بڑی شریر ہے۔ نجمہ کی گھریلو شرارتوں کے متعلق چند لطیفے، اتنے میں میری بیوی مسکراتی ہوئی اندر آئیں۔ میری بیوی کو مسکرانے اور پان کھانے کی بہت بُری عادت ہے۔ بیوی کے متعلق ایک پیرا بیوی نے مجھے اگنی ہوتری جی کا ایک خط لا کر دیا۔ جو ابھی ابھی ڈاکیہ دے گیا تھا۔ مسوری میں ڈاک کا انتظام تسلی بخش نہیں۔ بجلی اور گرم پانی کا انتظام بھی اچھا نہیں (بجلی، گرم پانی اور مسوری کی میونسپل کمیٹی کے متعلق ایک صفحہ) میں نے خط کھول کر پڑھا۔ اگنی ہوتری جی کا انداز تحریر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے حد شگفتہ ہے۔ خط پڑھ کر جی خوش ہوگیا اور جب میں خط پڑھ رہا تھا تو عالم خیال میں دیار رفت خیال میں) میرے سامنے اگنی ہوتری جی کی مسرت بھری آنکھیں چمک رہی تھیں (اگنی ہوتری جی کی چمکیلی آنکھوں اور ان کی شکل وشباہت کے متعلق ایک صفحہ بلکہ اگر ہو سکے تو دو صفحے) اگنی ہوتری جی نے مجھ سے دیباچہ لکھنے کی استدعا کی ہے۔ میں ہیچ مداں میرزکس لائق ہوں۔ اردو ادب کی خدمت کرتا ہوں۔ اردو خطرے میں ہے۔ یہی بات میں نے کل پچھلی کل ہند اُردو کانفرنس میں کہی تھی۔ جس کا میں صدر تھا (پچھلی کل ہند اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر کا خلاصہ دو صفحوں میں) جہاں تک دیباچہ لکھنے کا سوال ہے میں اسے بے معنی سمجھتا ہوں۔ آخر دیباچوں سے اردو ادب کی حفاظت کب تک ہوتی رہے گی۔ یہی سوال دن رات پریشان کر رہا ہے۔ میری صحت خراب ہو چکی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے (ڈاکٹروں کی رائے ـــــ رائے بہت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ ڈپتھیریا، اناستیھز اور سوم تومبلز جیسے خطرناک الفاظ بار بار آئیں ورنہ سارے دیباچہ کا مزا کرکرا ہو جائیگا) بہرحال مجھے اگنی ہوتری جی کی خوشنودی منظور ہے۔ اپنے دوستوں کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلا دیباچہ لکھا تھا (پہلا دیباچہ کب، کیسے اور کن حالات میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ان تمام دیباچوں کا جستہ جستہ تذکرہ جو بعد میں لکھے گئے چار صفحے) اگنی ہوتری جی نے مثنوی لکھی ہے۔ اُردو کی پرانی مثنویوں میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں بہت بلند پایہ ہیں (موازنہ مثنوی مرزا شوق اور گلزارِ نسیم، پانچ صفحے) یہ مثنوی جو اگنی ہوتری جی نے لکھی ہے۔ بہت خوب ہے۔ خیالات محاکات تضمین کی بادشاہی پر ایک فقرہ بہت ہی کامیاب مثنوی ہے۔ اگنی ہوتری جی ابھی نوجوان ہیں۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کی طرح بے راہ رو نہیں (ترقی پسند ادیبوں کے خلاف جتنے صفحے چاہے لکھ دیجیے) اگنی ہوتری جی

نے اگر اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو ایک دن آسمانِ ادب پر ستارہ بن کر چمکیں گے۔ ہونہار بروہ کے چکنے چکنے پات، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

احقر

خواجہ ایم۔ رفیع

"الہلال" مسوری

۱۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

دیکھا آپ نے اس طرح آپ تیس چالیس صفحوں کا دیباچہ بہ آسانی لکھ سکتے ہیں۔ اسی طریق پر عمل کر کے آپ پچیس پچاس تو کیا پانسو صفحوں کا دیباچہ لکھ سکتے ہیں اور ابدی شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی کتابوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دیباچے کا حجم تین چوتھائی ہوتا ہے۔ اور اصل کتاب کا حجم صرف ایک چوتھائی (اس میں جلد اور گرد پوش بھی شامل ہیں) یہ بھی دیباچہ نگار کا اعجاز ہے لیکن فن کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے لیے بڑی کد و کاوش کی ضرورت ہے۔

دیباچے کے آخر میں اس جگہ کا نام جہاں پر دیباچہ لکھا گیا ہو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا دیباچے کے آخر میں "مسوری" کا نام دیباچہ کی زینت کو دوبالا کرتا ہے۔ بصورت دیگر اگر آپ "الہلال" مسوری کی بجائے چنگڑ محلّہ لاہور" بازار مائی سیواں امرتسر" یا کھاری باولی دہلی لکھ دیں تو دیباچہ دو کوڑی کا ہو جائے گا۔ اور نہ کوئی کتاب پڑھے گا۔ نہ آپ کا دیباچہ اسی لیے دیباچے اور کتاب کی کامیابی کے لیے اپنے تخیل کو وسیع کیجیے۔ اگر آپ لاہور میں رہتے ہیں تو سنی دیو، گلمرگ لکھیے۔ امرتسر میں ہوں تو "اہلال مسوری" لکھیے۔ دہلی میں ہوں تو نینی تال لکھیے یعنی جس جگہ آپ رہتے ہوں اس سے جتنی دور اور جتنی اونچی جگہ کا نام آپ لکھیں گے آپ کے دیباچہ کو اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوگی۔ میں کہتا ہوں آپ "مسوری" "گلمرگ" بھی کیوں لکھیں۔ آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے دھڑک لکھیے۔ " میری مارلن کالج۔ آکسفورڈ سٹریٹ فورڈ آن ایوان انگلینڈ" آپ کے دیباچے کو چار چاند نہ لگ جائیں تو میرا ذمہ۔ بڑے بڑے جغادری نقاد بھی آپ کا لوہا نہ مان جائیں تو میرا نام نہیں۔!

یہ جو کچھ ابھی میں نے لکھا ہے یہ اصل میں دیباچہ ہے میری اس کتاب کا جو میں فن دیباچہ نگاری پر لکھ رہا ہوں یہ کتاب مکتبہ ہندوستانی لاہور سے شائع ہوگی قیمت ڈھائی روپے فی نسخہ محصول ڈاک بذمہ خریدار عید، دیوالی اور کرسمس کے دنوں میں یہ کتاب نصف قیمت پر فروخت ہوگی ابھی سے آرڈر بھیجیے، ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

٭

یوگا

میں بہت عدیم الفرصت ہوں۔ اس کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ مجھے دفتر جانا ہوتا ہے۔ میں نے دفتر کو اب ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔ اب میں صرف ریس کا کام کرتا ہوں۔ اور گھوڑ دوڑ کے لوگوں کے لگائے ہوئے ٹپ ہی میری معاشی و اقتصادی ضروریات کے کفیل ہو جاتے ہیں۔ ریس میں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ زیادہ عقل کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی لیے تو میں ریس کھیلتا ہوں) بس ریس میں یہ چاہیے کہ آنکھ بند کر کے جاکی کے ٹپ پر روپیہ لگا دیا جائے۔ تھوڑی دیر میں روپیہ پانی کی طرح برسنے لگتا ہے۔ میں سال میں صرف تین ماہ ریس کھیلتا ہوں۔ اور اتنا روپیہ کما لیتا ہوں کہ یہ رقم نہ صرف اس سال کے لیے بلکہ اگلے دو سالوں کے لیے بھی کافی ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے اگر میں ریس میں اسی طرح جیتتا رہا تو اپنی زندگی کے آخر میں اگلی دو زندگیوں کے آرام و آسائش کے سامان بھی بہم پہنچا لوں گا۔ عجیب شے ہے یہ ریس بھی۔۔! اس میں لگایا ہوا روپیہ پشت با پشت کام دیتا ہے۔

ہاں تو میں اپنی عدیم الفرصتی کا ذکر کر رہا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو مجھے بظاہر تین ماہ کی ریس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ وقت وافر ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے کٹتا نظر آتا ہے۔ لیکن بھلا ہو میری بری صحت کا کہ مجھے ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنوں کوئی نہ کوئی بیماری ضرور لاحق ہو جاتی ہے۔ دراصل میری عدیم الفرصتی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اکثر کیا عموماً بیمار رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، اپنے آپ کو ہمیشہ بیمار پایا ہے یہ بیماری کبھی دم نہیں لینے دیتی۔ اس سے کبھی فرصت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر فرصت ملتی تو خدا گواہ ہے کہ میں دنیا میں ضرور کوئی بڑا کام کرتا۔ سرکس کھولتا۔ اینٹوں کا بھٹہ بناتا۔ بینک کھڑا کرتا۔ غریب بیواؤں کے زیور گروی رکھتا۔ بنگال کے قحط زدگان کے لیے ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کرتا اور پھر اپنی رقم میں سے دس ہزار روپیہ قحط زدگان کی مدد کے لیے بھیج بھی دیتا الغرض کوئی ایک ایسا بڑا کام ضرور کرتا جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی کی نظروں میں بڑا آدمی بنا دیتا ہے۔!

لیکن بُرا ہو بیماری کا کہ اس نے کہیں کا نہ رکھا۔ اور کوئی ایک بیماری ہو تو بتاؤں۔ جب پیدا ہوئے تو تین ماہ بعد ہی اس زور سے چیچک نکلی کہ چہرہ شہد کی تھیلی کا خالی چھتہ بن گیا۔ پھر جوں جوں بڑے ہوتے گئے۔ بیماریاں بڑھتی گئیں۔ خسرہ، نمونیا، ٹائفائڈ، یرقان، عشق، اختلاج قلب، ملیریا، درد جگر، جوڑی کا تاپ، کالی کھانسی، سفید کھانسی، پیلی کھانسی، خونی کھانسی، قوس و قزح کی کھانسی۔ ہر رنگ کی کھانسی ہوئی جو آنکھیں دکھنے پر آئیں نہ صرف آنکھیں دُکھنے لگیں۔ بلکہ ہاتھ پاؤں دل، جگر، سینہ سب دکھنے لگے۔ جب پاؤں میں آبلے پڑے تو کلیجے میں بھی چھالے پڑ گئے۔ اور جگر میں تو ناسور تک ہو گئے پریشان کر دیا اس بیماری نے! یہ کمبخت کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ آخر جب میں اس بیماری کے ہاتھوں بالکل عاجز آ گیا۔ اور جب ماں کی گھٹیوں اور محلے والیوں کی جڑی بوٹیوں سے کچھ افاقہ ہوا تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ یہ ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر تھا۔

اس ڈاکٹر نے پہلے میری نبض دیکھی، پھر زبان، پھر پیشاب، پھر خون، پھر آنکھیں، پھر سینہ، پھر بلغم اور پھر میرے والد سے کہا۔ "اس لڑکے کو پرسوں

پھر لاؤ۔ جب تک میں خوردبین سے بیماری دیکھ لوں گا۔"

اس روز جب ہم وقت مقررہ پر پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف پیشاب میں کیلسیم آتا ہے۔"

"کیلسیم کیا ہوتا ہے۔؟" میرے والد نے پوچھا۔

"چونا۔!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"لاحول ولا۔" میرے والد نے جواب دیا۔ "ریل کے انجن اور ہوائی جہاز کے زمانے میں کیسی کیسی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ چونا۔!" پھر میرا کان مروڑ کر بولے "کیوں بے: کیا تو دن بھر چونا کھاتا رہتا ہے۔ خبردار جو آئندہ سے تو نے پاندان کو ہاتھ بھی لگایا۔"

لیکن پان نہ کھانے پر بھی بیماری میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بعد میں جب بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ مجھے ایک دم بہت بیماریاں لاحق ہو گئی ہیں۔ پیشاب میں کیلشیم آتا ہے تو خون میں لوہا۔ سانس میں کاربن آنسو میں نمک، بلغم میں سوڈا ہے تو سینے میں گندھک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا عالم جمادات میرے جسم میں آکر اکٹھا ہو گیا ہے۔ اور دنیا کا طاقتور سے طاقتور انجکشن بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ایلوپیتھک ڈاکٹر نے کہ جس کا سب سے بڑا حربہ انجکشن ہے میرے والد صاحب کو صاف جواب دے دیا۔ "مجھے افسوس ہے میں آپ کے لڑکے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

میں روتا ہوا کمرے سے واپس نکل آیا۔ میرے والد میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ "نہ رو بیٹا۔ ان آنسوؤں کو سنبھال کر رکھ۔ ان آنسوؤں میں نمک ہے۔!"

میں اپنی صحت کو بہتر بنانے کے لیے اور بیماری سے پیچھا چھڑانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کے پاس گیا اور بایوکیمسٹری والوں کے پاس جو صرف بارہ دواؤں سے جہان بھر کی بیماریوں کا علاج کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ لیکن ان بارہ دواؤں کے کھانے سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پھر میں نے ویدک اور یونانی دواخانوں کی طرف رجوع کیا۔ اور ہر اس جھاڑی کے پتے۔ پھل، پھول، جڑیں تک کھا ڈالیں جنھیں دیکھنے ہی سے متلی ہو جاتی ہے۔ اور جنھیں انسان تو کیا بھیڑ بکریاں بھی سونگھنا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن بیماری نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا۔ بیماری بھی بڑی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ میں بالکل جوان ہو گیا۔ اب ڈاکٹروں نے پینترا بدلا۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا۔ یہ لونڈا اس لیے بیمار رہتا ہے۔ کہ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔ فوراً اس کا بیاہ کر دو۔!

چنانچہ میری شادی بھی ہو گئی۔

لیکن میری بیوی کے غلبے سے بیماری کا غلبہ کم نہ ہوا۔ پہلے صرف ایک چیز کا غلبہ تھا۔ اب دو کا۔ بعد میں بچے پیدا ہوئے تو ان غلبوں کی تعداد چھ سات تک پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ مجھے انشورنس ایجنٹ کے پاس جانا پڑا۔

لیکن انشورنس سے بھی بیماری کم نہ ہوئی۔ البتہ کبھی کبھی منہ پر رونق آجاتی تھی۔ جس سے لوگ سمجھتے تھے کہ مریض کا حال اچھا ہے۔ پھر ایک دن مجھے ایک حکیم نے بتایا کہ مجھے تلی ہے۔

میں اچھل پڑا۔ "تلی ہے! سچ کہتے ہو حکیم صاحب مجھے تلی ہے۔؟"

"ہاں۔!"

"اور جگر بھی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں جگر بھی ہے۔" حکیم نے میرے سوال کو اچھی طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی جواب دیا۔

بعد میں جب میں دوسرے حکیموں کے پاس گیا۔ تو ان سے پتہ چلا کہ میرے نہ صرف تلی ہے۔ بلکہ جگر بھی ہے۔ دل ہے دو آنکھیں ہیں، دو بازو ہیں، دو ٹانگیں ہیں۔ ایک سر ہے۔ دو کان ہیں۔ غرض یہ کہ جہان بھر کی بیماریاں میرے

جسم میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ جب صورتِ حالات یہ ہوں تو انسان بیچارہ کیا کرے۔ جنگ نہ کرے تو کیا کرے۔ کیوں کہ انسان کے نہ صرف تلی ہے بلکہ معدہ بھی ہے۔ اور یہ معدہ اسے ہمیشہ لڑنے کے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دنیا میں سب جنگیں معدے کی وجہ ہی سے ہوتی ہیں۔ اور اگر اپنڈے سائٹس کی فالتو آنت کی طرح معدے کو بھی آپریشن کرکے انسانی جسم سے خارج کر دیا جائے تو انسانوں کے درمیان کبھی جنگ نہ ہو۔ کئی بار مغربی جراحوں نے آپریشن کے ذریعہ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ہر بار ناکام ہوئے ہیں۔ کیوں کہ انسانی جسم معدے کے بغیر بے کار ہو جاتا ہے اور اسی بے کاری کو موت کہتے ہیں۔ مغربی جراحی اس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اب یہ انسانی آدمی کی ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے۔ اور اسے ایک لکڑی کی ٹانگ دیدی جاتی ہے۔ اس لکڑی کی ٹانگ سے آدمی وہی کام لے سکتا ہے جو اصلی ٹانگ سے۔ اور ابھی حال ہی میں میں نے ایک امریکی پرچے میں ایک سپاہی کی تصویر دیکھی تھی۔ جو اپنے شہر میں رقص کے سالانہ مقابلے میں اوّل رہا تھا۔ اس سپاہی کی ٹانگ لکڑی کی تھی۔ یہ سپاہی خوبصورت امریکی دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور اسے دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں ایک کیا اپنی دونوں ٹانگیں کٹوا کر لکڑی کی ٹانگیں لگوا لوں، اور — خیر جانے دیجیے۔

ٹانگ کے علاوہ اور بہت سے انسانی اعضاء مصنوعی تیار کیے جاتے ہیں۔ اور انسانی جسم میں ریڈیو ویلوں کی طرح لگا دیے جاتے ہیں۔ اور خوبی یہ کہ انسانی جسم کے افعال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چنانچہ آج کل بیماری کے ذرا سے شبہ پر گردہ نکال لیا جاتا ہے آنت کاٹ دی جاتی ہے۔ پھیپھڑا تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ لارڈ نوفیلڈ کی مہربانی سے آج کل لوہے کے پھیپھڑے بننے لگتے ہیں کہ جن کے استعمال سے انسانی تنفس کے دورے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اور پھر ان مصنوعی اعضاء میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انسانی نشوونما کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسانی خون اور خوراک کی ضرورت نہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود علم جراحی میں ابھی یہ خوبی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ ایک ایسا معدہ ایجاد کرسکتے جو کھانا۔ طلب کرے۔ میں نے بڑے بڑے مغربی جراحوں سے نہایت صراحت کے ساتھ پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔

سب کی ایک ہی رائے ہے۔ مجھے معدے کی بیماری ہے۔

"لیکن یہ کیا بیماری ہے"

"پھر کیا کیا جائے" میں نے ملتجیانہ انداز میں ان سے کہا۔ "کیا کہیں سے کوئی ایسا معدہ نہیں تیار ہوسکتا ہے۔ جسے بالکل بھوک نہ لگے۔ لوہے کے پھیپھڑے یا لکڑی کی ٹانگ کی طرح"

جراحوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور میں آپریشن روم سے باہر چلا آیا۔

اس کے بعد میں نے ڈونگرے کے بال امرت سے لے کرامرت دھارا تک سب پیٹنٹ ادویہ آزما کر دیکھیں۔ مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بیسیوں فقیروں کے منتر جنتر، تعویذ گنڈے بھی پرکھ لیے۔ بیماری جوں کی توں ہی رہی سنیاسیوں اور کایا کلپ والوں کے پاس گیا۔ اور شنگرف کے کشتے سے لے کر اکسیر سنکھیا تک کھا ڈالی۔ لیکن نہ موت آئی نہ بیماری ٹلی۔ ایک پڑھے لکھے آدمی نے جو تازہ تازہ ولایت سے آیا تھا اور ابھی تک چھری کانٹے سے کھانا کھاتا تھا۔ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمھیں کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے۔ یہ ضرور کوئی ذہنی بیماری ہے"

"ذہنی بیماری۔؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہاں! ذہنی بیماری۔ تم اپنا علاج کسی سے کراؤ۔"

"وہ کون بلا ہے۔؟"

"ماہر علم نفسیات! ڈاکٹر حمید سے ملو۔ وہ حال ہی میں امریکہ سے یہ علم سیکھ کر آئے ہیں۔ جہاز پر وہ میرے ساتھ تھے۔ یہ لو ان کا پتہ۔!"

چنانچہ میں ڈاکٹر حمید کے ہاں پہنچا۔ ڈاکٹر حمید نے کہا۔

"میں جو کچھ پوچھوں صاف صاف کہتے جائیے۔ فوراً کہتے جائیے"

سوچے بغیر میں نے کہا۔ "بہت اچھا۔!"

ڈاکٹر حمید نے پوچھا۔ "آپ کا نام۔؟"

"میں نے کہا بھگتی لال"

"باپ کا نام۔؟"

"بھگتی لال"

"دادا کا نام۔؟"

"بھگتی لال"

"پردادا کا نام۔!"

"اُلو کی دُم فاختہ۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم" ڈاکٹر حمید کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے میرا جواب کاغذ کے ایک ورق پر نوٹ کیا۔ پھر بولے۔

"آپ کتنے بھائی ہیں۔؟"

"چار"

"کتنی بہنیں۔؟"

"دو۔!"

"کتنی بیویاں ہیں۔؟"

"ایک۔ اور اگر آپ نوکرانی کو بھی شامل کرلیں تو دو۔! میرا مطلب ہے کہ آپ نے صاف صاف جواب......"

"میں سمجھ گیا" ڈاکٹر نے ورق پر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

اب تیسرا دور شروع ہوا کہنے لگے۔ اب میں ایک لفظ کہوں گا آپ اس کے جواب میں جو آپ کے دل میں آئے فوراً کہیے"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا ۔" بہت اچھا میری جان۔"
مسکرائے کہنے لگے ۔" ابھی نہیں ۔ دیکھیے پہلے میں ایک لفظ کہتا ہوں۔"
ڈاکٹر حمید کچھ عرصہ خاموشی سے اپنی گھڑی کی طرف تکتے رہے ۔ پھر اچانک بولے ۔
"گدھا۔"
"آلو بخارا۔" میں نے کہا۔
"لوبی۔"
"پھندنا۔" میں نے جواب دیا۔
"رام راجیہ ۔!"
"چل چل چنبیلی باغ میں۔" میں نے جواب دیا ۔ ڈاکٹر حمید نے اسے فوراً نوٹ کر لیا ۔ پھر بولے ۔" اب میں ایک لفظ بولوں گا ۔ آپ کچھ کہیں گے ۔ میں پھر اُسے دہراؤں گا ۔ آپ پھر اُس کے جواب میں کچھ کہیں گے ۔ میں پھر اُسے دہراؤں گا ۔ آپ پھر......"
یا اللہ یہ کیسا تماشہ ہے ۔
"چلیے" میں نے کہا ۔
وہ بولے ۔ "صابن ۔؟"
میں نے کہا ۔ "دھوبن ۔"
وہ بولے ۔ "دھوبن۔"
میں نے کہا ۔ "فیڈری داس۔"
وہ بولے ۔ "فیڈری داس۔"
میں نے کہا ۔ "بکواس۔"
وہ بولے ۔ "بکواس۔"
میں نے کہا ۔ "چپ۔"

وہ بولے ۔ "چپ۔"
میں نے کہا ۔" کہہ ، کہہ ، کہہ ، کہہ۔" یکایک میں نے طوطے کی آواز نکال کر ہکلانے لگا۔
"ہم ۔" ڈاکٹر حمید نے زور سے میری گدی پر ہاتھ مارا ۔" پکڑ لیا آخر آپ کو ہکلانے کا مرض ہے۔"
"لیکن ڈاکٹر صاحب میں تو کبھی نہیں ہکلاتا۔"
"آپ نہ ہکلائیے ، اس سے کیا ہوا ہے ، یہ مرض آپ کے لاشعور میں ہے ۔!"
"لاشعور میں ۔؟"
"ہاں لاشعور کی لہروں میں تیر رہا ہے ۔ اور یہ مرض آپ نے ورثہ میں پایا ہے۔ اپنے باپ سے یا اپنی ماں سے۔"
"لیکن میرے باپ بالکل نہیں ہکلاتے ۔ غالباً یہ مرض ان کے لاشعور میں بھی یہ" میں نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔
"ہاں ٹھیک ہے ۔ وہاں بھی تیر رہا ہے ۔ انھوں نے غالباً اپنے ماں باپ سے......" ڈاکٹر نے پوچھا۔
"میں نے اپنے دادی دادا ، نانا ، نانی کو اچھی طرح دیکھا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب وہ بالکل صاف رواں بولتے تھے ۔ میری طرح ــــ" میں نے کہا۔
"آہ آپ لاشعور کی لہروں سے واقف نہیں ۔ ہزاروں امراض یہاں تیرتے ہیں ۔"
"تو پھر یہ مرض کس طرح دفع ہوگا ؟" میں نے پوچھا۔
"دفع ہوگیا۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا ۔" لائیے میری فیس ۔" اور انھوں نے ہاتھ بڑھایا ۔
"دفع بھی ہوگیا ۔؟" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔" یہ کیوں کر ۔؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر صاحب بولے۔ "یہ علم نفسیات کا ایک تحلیلی عملیہ ہے کہ جب کسی مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے۔ اور مریض کو پتہ چل جائے کہ اسے کیا بیماری لاحق ہے تو وہ مرض اسی دم تحلیل ہو جاتا ہے۔ سمجھے آپ۔ لائیے ساٹھ روپے۔"
اور پھر میں نے اپنے ساٹھ روپوں کو ڈاکٹر کی میز کی دراز میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھا۔

اور لاشعور کی لہریں فضا میں تیر رہی تھیں۔

علم نفسیات کے تحلیلی عملیے نے مجھے دو چار دن جکڑے رکھا۔ وہ تو خیر ہے کہ وہ ہکلاپن جو مجھے کبھی نہ ہوا تھا اب دور ہو گیا۔ اس سے بیمار جسم کو اور کوئی فائدہ نہ پہنچا تھا۔

چنانچہ میں نے پلاسٹک سرجری کے ماہروں سے مشورہ کیا کہ مجھے اس بارے میں کیا کرنا چاہیے۔ پلاسٹک سرجری آپ جانتے ہیں ان دنوں اپنے عروج کے انتہائی نقطے پر ہے۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کی ناک آتشک کی وجہ سے بیٹھ گئی ہو یا خدانہ کرے کسی نے آپ کی ناک کاٹ لی ہو تو پلاسٹک سرجری کے ذریعہ سے فوراً نئی ناک لگائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کے ہونٹ بھچے ہوئے زنجیری کی طرح بدصورت اور بدنما ہیں تو انھیں پلاسٹک سرجری سے گلاب کی پتی کی طرح حسین و جمیل بنایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک گیا ہے تو اسے چٹکیوں میں یوں غائب کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جنگِ عظیم میں اس صنف کے ڈاکٹروں نے کمال کر دکھایا ہے۔ یہ لوگ جلی ہوئی انسانی کھال کی جگہ نئی جلد لگا دیتے ہیں نئے کان عطا کر دیتے ہیں۔ نئے پپوٹے، نئی آنکھیں۔ نئی بھویں، سر گنجا ہو تو کھوپڑی کے اوپر بال بھی لگا دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کھوپڑی کے اندر دماغ نہ ہو تو وہ بھی ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ پلاسٹک سرجری کے ماہروں سے مشورہ ......

"مجھے ایک نیا جسم چاہیے۔ بالکل نیا جسم، میں اس جسم کو تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔"

پلاسٹک سرجری کے ماہروں نے کہا۔ "ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کو نیا جسم نہیں عطا کر سکتے۔ ہم تو مرمت کرنے والے موچی ہیں، نیا بوٹ نہیں بناتے۔"

❖ ❖ ❖ ❖

کہتے ہیں جب چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب تاریک اس قدر مہیب اور خوفناک ہو جاتی ہے کہ دل لرزنے لگتا ہے تو اسی تاریکی کے سینے میں خود بخود روشنی کی کرن پھوٹتی ہے، اور اندھیرے کو اپنی ضو سے چکا چوند کر دیتی ہے۔

میری اندھیری زندگی میں یکایک روشنی کی کرن جگمگا اٹھی۔ ایک یوگی نے میری تاریک قسمت کو روشن کر دیا۔

یوگی نے کہا۔ "بیٹا یوگ کا پالن کرو۔ یوگ کی راہ پر چلو۔ تمھاری سب بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ اور تمھاری روح کو بھی سکون حاصل ہوگا۔ شانتی چاروں طرف شانتی"
یوگی نے مجھے یوگ کے اصول بتائے اور اب میں آپ کو بتاتا ہوں تاکہ جس طرح میری بیماری دور ہو گئی ہے۔ خدا کرے آپ کو بھی اس طرح فائدہ پہنچے!
یوگ کے ایک سو بیس آسن ہیں۔

پہلا آسن

سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور چھاتی پھلا کر اندر سانس کھینچو۔ اندر سانس روکو۔ حتیٰ کہ پھیپھڑا پھٹ جائے لیکن پھیپھڑا پھٹنے کی مطلق پروا نہ کرو۔ جب تک پھیپھڑا نہ پھٹے یوگ کا پہلا آسن مکمل نہ ہوگا۔

دوسرا آسن

چت لیٹ جاؤ۔ اور اپنے پاؤں کی انگلیوں سے اپنے سر کو چھونے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کرو۔ اگر ناکام رہو تو پھر کوشش، اور کوشش کرو۔ حتیٰ کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور تمھارے پاؤں کی انگلیاں سر سے جا لگیں۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے پر مطلق پروانہ کرو۔ کیوں کہ یہ یوگ کا دوسرا آسن ہے۔

تیسرا آسن

اسے شیر شنک آسن بھی کہتے ہیں۔ اس آسن میں مبتدی سر کے بل کھڑا ہوتا ہے ٹانگیں اوپر سر نیچے۔ ہر روز دس منٹ تک اپنے کمرے میں اسی طرح کھڑے رہو۔ پھر آہستہ آہستہ سے کمرے میں اسی طرح چلنے کی کوشش کرو پھر کمرے کے باہر سڑک پر چلو۔ پھر بازار میں ٹرام کے سامنے اسی طرح چلو حتیٰ کہ ٹرام سے تمھارا سر ٹکرا کر چکنا چور ہو جائے۔ لیکن اس کی بھی مطلق پروانہ کرو۔ یوگ کا آسن تمھاری روح کو سچی خوشی عطا کرے گا۔

چوتھا آسن

آلتی پالتی مار کر بیٹھو (دیکھو مہاتما بدھ کی تصویر) اور دو برس تک اسی طرح بیٹھے رہو۔ حتیٰ کہ تمھارا جسم پتھر کی طرح سخت ہو جائے اور تمھیں کسی عجائب خانہ رکھدیا جائے۔ لیکن اس کی بھی مطلق پروانہ کرو۔ عجائب خانہ میں تمھاری وہ عزت و تکریم ہوگی جو تمھیں اس زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

پانچواں آسن

اپنے ہاتھ پیٹھ پر باندھ کر اپنے سر کو اپنی ٹانگوں میں پھنسا لو۔ اور ایک گیند کی طرح فرش زمین پر لڑھکو۔ حتیٰ کہ محلے کے لڑکے تمھیں فٹ بال سمجھ کر تم سے کھیلنے لگیں اس طرح کھیلتے کھیلتے تمھارا جسم ربڑ کی طرح لچکدار ہو جائے گا۔

آٹھواں آسن

اب دائیں طرف کی ٹانگ اوپر اٹھا لو۔ اور صرف ایک ٹانگ کے سہارے تین سال تک اسی حالت میں کھڑے رہو۔

نواں آسن

اب دوسری ٹانگ بھی اٹھا لو۔ اب تم فضا میں بالکل معلق ہو، دیکھا تم نے یوگ کا اعجاز۔

دسواں آسن

لکڑی کا ایک تختہ لو جس پر لوہے کی بڑی بڑی کیلیں باہر کی طرف ابھری ہوں اب ان میخوں کے بستر پر لیٹ جاؤ۔ اور بازار میں بھیک مانگنا شروع کر دو۔

(یوگ آسن کا پہلا حصہ ختم ہوا)

میں ابھی تک پہلے دس آسنوں کی تکمیل کر سکا ہوں ابھی پچھلے سال اپنے کیلوں کے بستر پر لیٹا لیٹا کوروکیشتر کی سیر بھی کر آیا ہوں۔ میرا تن ہر طرح کی جسمانی بیماریوں سے پاک ہے میری روح ہر قسم کی زمینی آلائشوں سے مبرا۔ کوروکیشتر کے میلے پر لاکھوں یاتریوں نے میرے درشن کیے۔ اور کئی امریکنوں نے میرے فوٹو لیے اور لاکھ روپیہ چڑھاوا وصول ہوا۔

اور یہ سب کچھ یوگا کی برکت سے ہوا

آپ بھی یوگ کے آسن سیکھیے۔ اس پر عمل کیجیے۔ ایک سو بیس آسنوں کا حال میری کتاب۔ "یوگ، کیوں اور کیسے؟" میں درج ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ آدارہ یوگی پوسٹ بکس نمبر ۳۲۰۔ شکار پور سندھ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ردّی

تعریف!

یہ غلط ہے کہ ہر بری اور رذیل شے کو ردّی کہتے ہیں۔ دراصل ردی صرف اسی شے کو کہا جاتا ہے جو ردّی ہو اور یہی ردّی کی تعریف ہے۔

مثال!

یہ مضمون کیسا ہے۔؟	ردّی!
یہ کپڑا کیسا ہے۔؟	ردّی!
یہ کھیل کیسا ہے۔؟	ردّی!
یہ کاغذ کیسا ہے۔؟	ردّی!

یعنی اگر بُری سے بُری شے کی بُری سے بُری حالت دکھائی مقصود ہو تو بھی اسے ردّی کہیں گے۔ ردّی نہ گھٹانے سے گھٹتی ہے۔ نہ بڑھانے سے بڑھتی ہے بلکہ ہر جگہ ہر حالت میں ردّی میں سے ردّی نکال لیجیے تو بقایا پھر ردی ہے۔ اگر ردی کو ردّی سے ضرب دیجیے تو حاصل ضرب ردّی ہے۔ اگر ردّی کو ردی پر تقسیم کیجیے تو بھی آخر ردّی حاصل ہوگی۔ ردّی کا ذواضعاف اقل بھی ردّی اور ردّی کا عاد اعظم بھی ردی اور دُنیا میں یہ فخر صرف ردّی کو حاصل ہے! گویا ردی بھی مادے کی طرح اٹل ہے۔ ایک ہی صفت، ایک ہی وزن، ایک ہی خوبی کی مالک ہے۔"

ردّی!

جنگ سے پہلے ردّی کی حالت غیر تھی۔ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے۔ ردّی کا نام ذہن میں آتے ہی زندگی کے تمام گھناؤنے پہلو اپنے بدصورت نگار خانوں کو لیے تخیل میں آموجود ہوتے تھے۔ ردّی کا ذکر آتے ہی ان کباڑ خانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ جہاں پر کرم خوردہ کتابیں، ٹینس کے ٹوٹے ہوئے بلّے۔ کوڑ، سہ رنگی تصویروں والے رسالے اور اخبار، چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن، مرمر کے شکستہ بت، مزین جنھیں دیمک چاٹ گئی تھی۔ اور سڑے ہوئے ربڑ کی بوتلیں جن میں کسی زمانے میں گرم پانی بھرا جاتا تھا۔ رکھی رہتی ہیں۔ یا پنساری کی دوکان جہاں ہلدی کے انبار مونٹ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح بلند ہوتے اور دار چینی اور قہوہ اور الائچی اور نمک پسا ہوا بکتا۔ ردّی کے ساتھ ہمیشہ ردّی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ دراصل یہ ردّی کی خاصیت ہے۔ اس کا کیمیائی عمل یہ ہے کہ جس چیز کو چھوتی ہے۔ اسے بھی ردّی بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا پارس پتھر ہے۔ میں نے ہزار بار کوشش کی۔ لیکن ردّی دیکھ کر یا ردّی کا خیال کرتے ہوئے میرے ذہن میں کبھی نے خوش رنگ لب لعلین، سنبل و ریحان، چشم آہو کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ اگر یاد آئی بھی تو باسی پکوڑیوں کی سڑے بسے شامی کبابوں کی۔ یا اس پرانے جوتے کی جسے میں موچی کے پاس کئی بار مرمت کرانے لے جاتا ہوں۔ اس پر میری یہ ہمت کہ ردّی کی تعریف میں مضمون لکھ رہا ہوں۔ میری جرأت کی داد دیجیے۔ فرہاد کی کوہ کنی بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یعنی بالکل ردّی ہے۔!

موجودہ عالم گیر جنگ سے پہلے نہ صرف ردّی مضمون لکھنے والوں کی حالت غیر تھی۔ بلکہ ردّی کے متعلق کسی قسم کی تجارت کرنے والوں کا حال پتلا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں مہینے کی ہر پندرھویں کو جیب ٹٹولتا اور جیب میں سگریٹ کے بھی پیسے نہ پاتا تو چار و ناچار ردّی کا رخ کرتا اس وقت منوں ردّی بیچ کر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سگریٹ کے پیسے حاصل نہ ہوتے تھے۔ بہت ہوا تو ایک پیکٹ خرید لیا کونڈر کا، اس شان سے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مار دی۔ میرا مطلب ہے۔ ردی مار دی اور اگر ردی بیوی کے ہتھے چڑھ گئی۔ تو وہ ننھے کے لیے جھنجھنا خرید لیتی تھی۔ اور ایک بار تو شاید ربڑ کی سالم گڑیا ردی کے عوض میں ملی تھی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو جھنجھنے اور ربڑ کی گڑیا سے زندگی کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ردی کی تجارت میں کوئی خاص نفع نہ تھا۔ ردی بیچنے والوں کا بازار الگ تھا۔ وہاں اکثر چوہوں کی بہتات تھی۔ انھیں کوئی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ردی بیچنے والوں سے ہے۔ چوہوں سے نہیں۔ کباڑیے اور میونسپل کمیٹی کی کوڑا کرکٹ کی لاری کا ڈرائیور اور گلی گلی ردی بیچنے والے تو خیر برے تھے۔ لیکن ہم لوگ بھی جو کبھی کبھار ردی بیچتے تھے۔ بری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کمینہ، کم ظرف، خسیس، ردی تک بیچ ڈالتا ہے۔ اور اس قسم کے القاب سے یاد کیے جاتے۔ جنگ سے پہلے میں اگر یہی ردی پر مضمون لکھتا تو ایڈیٹر فوراً اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ جو عموماً ایڈیٹر کی میز کے نیچے اس کے قدموں میں رکھی ہوتی ہے۔ کہ عورت اور ردی کا یہی ٹھکانہ ہے۔ اور ردی پر جو مضمون ہو اس کا حشر بھی یہی ہونا چاہیے۔

لیکن یہ سب جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔

اب صرف اچھے مضمون ردی کی ٹوکری میں پھینکے جاتے ہیں، اور ردی کی ٹوکری بھی میز کے نیچے نہیں بلکہ میز کے اوپر ایڈیٹر کے سامنے رکھی رہتی ہے۔ اور ردی کا ایک ایک پرزہ اس میں احتیاط سے گن کر ڈالا جاتا ہے۔ بینک کا منیجر بھی نوٹوں کو اس احتیاط سے نہیں گنتا کہ جس احتیاط سے یہ ردی گنی جاتی ہے۔ خدا بارہ برس کے بعد ردی کی سنتا ہے۔ بلکہ بیس برس ہی سمجھیے کیوں کہ پچھلی جنگ عظیم غالباً ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ حساب کر لیجیے۔ ہم نے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو کیا ردی ہی پر مضمون لکھتا؟ جنگ میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں۔ اور آدمی سستے

ہو جاتے ہیں۔ چاہے یہ جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہو یا جمہوریت کے خلاف یا فسطائیت کے خلاف یا جاگیرداروں کے خلاف۔ جنگ کا یہ ایک ایسا اقتصادی پہلو ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر اتنا ہی آسان اور بدیہی ہے۔ جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں اور نو دو گیارہ ہوتے ہیں اور جنگ میں صرف ہندسے ہی نہیں بلکہ لوگ بھی نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن خیر ہر جنگ میں یہ قربانی ناگزیر ہے اس قربانی کے بغیر ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے انسان کو مہنگائی بھی ایک حد تک گوارا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک حد تک، اور جب مہنگائی اس حد سے تجاوز کر جائے تو بڑی مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے۔ عموماً اس مضحک صورت کو جنگی مزاج کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مضحک صورت تو یہ ہے کہ آدمی سترہ روپے میں بکتا ہے اور جوتا اٹھارہ روپے میں اور ایک اچھا جوتا اڑتالیس روپے میں پہلے اڑتالیس روپے میں ایک بھینس آتی تھی اب اتنے روپے میں تین آدمی بکتے ہیں۔

کوئلہ لیجیے، کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنے لگا۔ تو گیہوں کے برابر ہو گیا۔ بازار جائیے تو کوئلہ بھی اسی بھاؤ میں ملتا ہے۔ جس بھاؤ گیہوں۔ اب چاہے کوئلہ کھا لیجیے چاہے گیہوں۔ چاہے گیہوں جلائیے چاہے کوئلہ۔ پھر کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو گندم سے دگنا ہو گیا۔ یعنی اب اشرفیاں اور لٹیں اور کوئلوں پہ مُہریں زیادہ فائدہ نظر آنے لگا۔ اور لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ کوئلے کی بجائے گیہوں جلائیں۔ پھر جب گیہوں بھی نہ ملا۔ تو وہ اپنا جی جلانے لگے۔ اور جب بالکل ہی جی سے گزر گئے۔ تو گئے دونوں جہان نظر سے گذر۔ تیسری صورت کا کوئی بشر نہ ملا۔

یہی حال تانبے کا ہوا۔ یعنی جب تانبے کا بھاؤ بڑھنے لگا تو اس قدر کہ بازار میں پیسہ تک دیکھنا مشکل ہو گیا۔ بھاؤ اس قدر بڑھا کہ چاندی سے بڑھ گیا۔ پھر گیا تھا۔ لوگوں نے بینکوں سے اپنے چاندی کے زیور نکلوا لیے اور ان کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جگہ تانبے کے برتن رکھ دیئے۔ پھر روئی کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو سونے کے زیور بیچ دیئے اور اپنے گھر کے توشک اور لحاف بینک میں محفوظ کرا دیئے۔ کون جانے بھئی کس دم کیا ہوتا ہے۔ "میاں یہ جنگ ہے۔ اپنا مال بینک میں محفوظ کرا دو۔ ہاں۔

اور پھر کاغذ۔ ہاں صاحب کاغذ بھی دون کی لینے لگا۔ یہ ذلیل چیتھڑے جو بانس کے ریشوں اور میلے کچیلے کپڑوں سے بنتا ہے۔ یہ بھی صاحب کیا بتاؤں آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا بھاؤ جو اوپر چڑھنا شروع ہوا تو کوئلے اور گیہوں کے بھاؤ سے بھی بڑھ گیا۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ ان دونوں رسالوں کے مالک اور ناشر لوگ بہت پریشان تھے۔ خریدار کتابیں اور رسالے مانگتے تھے اور ناشر کہتے تھے دو سیر گیہوں لے لو۔ تین سیر کوئلہ لے لو۔ لیکن رسالہ یا کتاب نہ طلب کرو۔ مضمون نگار اپنا مضمون حفظ کر کے ایڈیٹر کو سُناتا تھا۔ اور اگر ایڈیٹر کو وہ پسند ہوتا تو وہ مضمون۔ میرا مطلب ہے مضمون نگار کو کاتب کے حوالے کر دیتا۔ اور مضمون نگار پھر کاتب کو اپنا مضمون سُناتا۔ جب جا کر کاتب کتابت کرتا ہے۔ بعد میں جب کاغذ اور بھی گراں ہو گیا۔ تو کاتب کو بھی مضمون حفظ کرنا پڑتا۔ اور وہ لیتھو کے پریس میں جا کر حروف کندہ کرتا اور اس طرح کہیں جا کر پرچہ چھپتا تھا۔ لیکن کاغذ کی گرانی اور بھی بڑھتی گئی۔ اور کاغذ کی قیمت کپڑے سے بھی بڑھنے لگی۔ ان دنوں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندو مسلم کی مناسبت سے ہندو اخبار اپنے خریداروں کو اخبار کی بجائے ایک دھوتی دیا کریں اور مسلمان اخبار لٹھے کی شلوار اور جو ادبی پرچے ہوں وہ کاغذ کی بجائے کپڑے پر چھپیں۔ کپڑے ہی کی مضبوط جلد ہو اور کپڑے ہی کے ورق، پاپلین کے ورق، یا لٹھے کے ورق یا سپید ریشم کے ورق اور رنگین چھینٹوں پر سہ رنگی تصویر شائع ہوں۔ اعلانات اس قسم کے ہوں۔

"رسالہ ساقی پڑھیے۔ کورے لٹھے پر شائع ہوتا ہے۔ خالص پاپلین کی جلد ہے جسے دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ساقی بجلوہ دُشمن و ایمان آگہی۔"

"رسالہ ہمایوں ہر یکم تاریخ کو نہایت باقاعدگی سے چھتیس نمبر کی ململ پر شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے آج تک کبھی کمتر استعمال نہیں کیا۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔!"

"رسالہ ادبِ لطیف پڑھیے۔ ہندوستان کا واحد ترقی پسند ماہنامہ ہمیشہ ہاتھ کا بنا ہوا دوسوتی کپڑا استعمال کرتا ہے رسالہ ادبِ لطیف پڑھیے اور اپنے ملک کے جولاہوں کی مدد کیجیے۔ مزدور کسان زندہ باد۔!"

پہلے پہل صرف سگریٹوں کے پیکٹ لوٹائے جاتے تھے۔ پھر کپڑوں پر چھپے ہوئے رسالے بھی لوٹائے جانے لگے۔ بصورت دیگر نئی کتابیں اور نئے رسالے دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان پُرانے رسالوں کو لانڈری میں بھیج دیا جاتا۔ جہاں سے یہ رسالے دُھلے دُھلائے واپس آجاتے اور پھر مطبع میں چھپ کر انھیں خریداروں کو بھیج دیئے جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ مطبع کے سامنے رسالے دھونے والی لانڈری بھی کھل گئی۔ آپ نے کئی جگہ اس قسم کا اشتہار پڑھا ہوگا۔

صفا چٹ لانڈری۔

یہاں رسالہ ساقی دھویا جاتا ہے۔

عید نمبر، افسانہ نمبر اور سالنامے بھی ڈرائی کلین کیے جاتے ہیں زنانہ رسالوں کو دھونے کا خاص انتظام ہے۔

صفا چٹ لانڈری۔

سے

اپنا رسالہ، اپنی کتاب، اپنا اخبار دھلوائیے۔

اور آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیا اخبار، نیا رسالہ، نئی کتاب حاصل کیجیے۔
اللہ جو شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو۔!

لیکن اب وہ زمانہ بھی تقریباً بیت چکا ہے۔
اب اک نیا دور آیا ہے۔
ردی کی قیمت بڑھ رہی ہے۔

بازار سے اگر آپ ایلومونیم کے برتن خریدیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک دیگچی خریدیں تو چھ سات روپے میں مل جائے گی۔ لیکن یہی دیگچی آپ توڑ پھوڑ کر دوسرے دن کباڑیے کے پاس لے جائیں تو وہ اس کے آپ کو آٹھ نو دس روپے تک دے دے گا۔ کیوں کہ ایلومونیم ایک قیمتی دھات ہے سب دھاتوں میں ہلکی دھات ہے۔ اس لیے ہوائی جہازوں کی تعمیر میں کام آتی ہے۔ اور ایلومونیم اکٹھا کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہے کہ لوگوں سے ایلومونیم کی بے کار چیزیں مول ضرور لے لی جائیں۔ چنانچہ آج کل کئی لوگوں نے یہی تجارت شروع کر رکھی ہے۔ وہ بازار سے نیا برتن لاتے ہیں اور اسے توڑ پھوڑ کر سوائے یا ڈیوڑھے داموں کسی کباڑیے یا ایلومونیم اکٹھا کرنے والوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔

یہی حال ردی کا ہے۔

ردی اکٹھا کرنے والوں اور ردی بیچنے والوں کے مزے ہیں۔ ردی کی قیمت اصل کاغذ سے دگنی ہو گئی ہے۔

چنانچہ اگر آپ بازار سے ایک کتاب کوئی ایک کتاب خرید لیجیے۔ چلیے میری کتاب ہی خرید لیجیے۔ آخر اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ اور پھر اس کتاب کو خرید کر سیدھے کباڑیے کے پاس لے جائیے۔ تو وہ اسے تول کر آپ کو دام دے گا۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح سے جو قیمت آپ نے اس کتاب کی ادا کی ہے۔ اس سے دگنے دام آپ کو کباڑیے سے مل جاتے ہیں

کیوں کہ ناشر تو ابھی تک تول کر نہیں دیتے۔ وہ تو یونہی اٹکل پچو کتاب کی قیمت لگا دیتے ہیں۔ اور کباڑیہ کتاب کا مضمون دیکھ کر نہیں۔ کتاب کا وزن تول کر قیمت لگاتا ہے۔ چنانچہ آج کل کتاب لکھنے میں یا کتاب چھاپنے میں اتنا فائدہ نہیں جتنا کتاب کو ردی بنا کر بیچنے میں۔ اس سے ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اب نفس مضمون یا اسٹائل پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو باقاعدہ حروف لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہی کافی ہے کہ آڑی ترچھی لکیریں کاغذ پر کھینچ دی جائیں۔ اور کتاب کو پریس میں چھاپ لیا جائے۔ اور پھر اُسے فوراً کسی کباڑیے کے ہاں فروخت کر دیا جائے میں سوچتا ہوں اس طرح ایک کتاب کے ایک مہینے میں ایک نہیں درجنوں ایڈیشن نکل سکتے ہیں۔ اور فوراً کباڑیے کے پاس فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ کورا کاغذ آج کل ردی سے بہت سستا ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ میں دفتر سے پچھتر روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ دس پندرہ بیس روپے مضمون لکھ کر مہینے میں کما لیتا ہوں۔ پھر ایک درجن کتابوں کی چھ روپے رائلٹی بھی آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کی وجہ سے مہنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ گھر میں ردی نہ بیچوں تو گھر کا خرچ کبھی پورا نہ کر سکوں۔ چنانچہ ہر ماہ جو رسالے و اخبار اور کتابیں میرے پاس آتی ہیں صرف انہیں کباڑیے کے حوالے کر کے میں ایک سو، سوا سو روپیہ کما لیتا ہوں۔ اب سوچتا ہوں یہ تو بہت ہی نفع بخش تجارت ہے۔ اور اگر ردی کی قیمت اسی طرح بڑھتی گئی۔ تو وہ دن دور نہیں جب مصنف کو اپنا مسودہ ناشر کی بجائے ردی والے کے پاس فروخت کرنے میں زیادہ فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ ردی والا نفس مضمون نہیں دیکھتا۔ وزن دیکھتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے بال و پر

سائنس دانوں نے کہا ہے کہ اگلے دو ہزار سال میں انسان اتنی ترقی کر جائے گا۔ کہ اس کے سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں جہاں تک میرا اور میرے دوست خواجہ احمد عباس اور ن م راشد کا تعلق ہے ہم آج بھی عام آدمیوں سے دو ہزار سال آگے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ سُن کر کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ دو ہزار سال بعد ہر انسان کی چندیا نئے انڈے کی چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ کیوں کہ صحیح ترقی کا راستہ بھی یہی ہے۔ یہ راستہ جس کے سنگ میل میرے اور راشد کے سر ہیں انسانوں کی زندگی میں ایک گنجے دور کا آغاز کرتا ہے۔

مجھے مردوں کے گنجے ہونے کا تو افسوس نہیں ہے۔ لیکن یہ عورتوں والا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ آج سے دو ہزار برس بعد کی عورت کے متعلق غور کیجیے تو غور کرنا ذرا مشکل کام نظر آتا ہے۔ ہم جو زلفِ دوتا کے عاشق ہیں اور لہراتی ہوئی زلف کے اسیر اس زمانے کے متعلق کیا سوچ سکتے ہیں۔ کہ جب عورت کے سر پہ بال ہی نہیں ہوں گے۔ مگر اس وقت شاید عورت کا معیارِ حسن بھی بدل جائے گا۔ اور آج کل کی لمبے لمبے بالوں والی عورتوں کو وحشی اور بربری قرار دیا جائے گا۔ آج کل تو ہم فیض کے ساتھ ہم زبان ہو کر کہتے ہیں۔ ہائے اس زلف کی گھنی چھاؤں میں۔ مگر آج سے دو ہزار سال بعد جب یہ چھاؤں ہوگی ہی نہیں۔ دھوپ ہی دھوپ

ہوگی۔ اس وقت ایسی شاعری بھی نہیں چلے گی اور غالب کے اس شعر پر ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہو گئیں

لوگ سر نہیں دُھنیں گے۔ سُن کے ہنسیں گے اور بڑا نے شاعروں کی کور ذوقی کا ماتم کریں گے۔ جو انسان بالوں جیسی ناکارہ اور غیر مُفید شے کے متعلق قصیدے لکھتے رہے ہیں اور جن کے دیوان زلفوں کی برہمی اور گیسوؤں کے تعطر سے بھرے پڑے ہیں۔ کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ جس طرح انسان کی دم جھڑی ہے اسی طرح اس کے بال بھی جھڑ جائیں گے۔ اس لیے یہ بالوں کی شاعری بالکل جانے والی ہے۔ جس طرح آج ہم کسی دم والے انسان کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ اس سے عشق کرتے ہوں۔ اسی طرح آج سے دو ہزار برس بعد کے انسان کو بھی لمبے لمبے بالوں والی عورت کے تصور ہی سے گھن آنے لگے گی۔ اور وہ یہ سوچ ہی نہیں سکے گا کہ ہم لوگ کیسے اس مخلوق سے عشق کرتے تھے۔ بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ رومان اور حسن کی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ آج کل نثر نگار عورت کی سیندور بھری مانگ کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کرتا ہے۔ اس زمانے میں اوّل تو مانگ ہوگی ہی نہیں۔ اور اگر ہوئی تو سیندور سارے سر پر پھیلا ہوگا۔ اور چار ابرو کا صفایا ہوگا۔ اور پلکوں کی صف بھی رخسار پر آراستہ نہ ہوگی۔ آج کل کا عاشق اپنے معشوق کے بالوں سے کھیلتا ہے۔ ان میں انگلیاں پھیرتا ہے۔ ان کی خوشبو سونگھتا ہے۔ انھیں اپنے رخساروں سے لگا کے چوم لیتا ہے۔ یہ سب بے ہودہ باتیں آج سے دو ہزار سال بعد ختم ہو جائیں گی۔ گو ہماری حکومت کے کئی وزیر تو انھیں آج ہی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے خود سر عوام ہیں کہ وہ ان غافلوں کی دور اندیشی نہیں پہچانتے۔ وہ آج کی بات سوچتے ہیں۔ آج سے دو ہزار برس بعد کی بات نہیں سوچتے کہ جب عاشق اپنے محبوب کے بالوں میں انگلیاں نہیں اس کی چندیا پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور اس کی شفاف جلد کی نرم و نازک گداز یت جس میں ایک بال بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چبھنے والا نہیں ہوگا۔ اس مخملیں۔ بالائی جیسی نرم نرم گدازیت سے اپنی روح کو معمور کرے گا۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ کیا کھوپڑے کے اوپر ایسی گدازیت ممکن ہے۔؟ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا آج تو ممکن نہیں لیکن آج سے دو ہزار برس بعد ہر بات ممکن ہو سکتی ہے۔

جب انسان کے جسم پر بال نہیں ہوں گے تو نہ صرف شاعری بدلے گی اور عشق کرنے کا طریقہ بدلے گا۔ بلکہ صنعت و حرفت کے سارے شعبے بھی بند ہو جائیں گے۔ مثلاً کنگھیوں کے کارخانے بند ہو جائیں گے کیوں کہ کنگھی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بال صفا پوڈر خود صاف ہو جائے گا۔ اور یہ بالوں کو بڑھانے کے لوشن اور ہیر سنگھار آئل، شیو کا صابن اور بالوں کے کاٹنے کی قینچیاں، استرے، بلیڈ، مردوں کی مونچھیں اور مولویوں کی داڑھیاں یہ سب اشیا آج سے دو ہزار سال بعد عجائب گھروں کی زینت ہوں گی اور اس زمانے کے لوگ انھیں دیکھ دیکھ کے اس طرح حیران ہوا کریں گے جس طرح ہم قرونِ وسطیٰ کے آہنی خود اور فولادی جالیاں ڈھال اور شمشیر دیکھ کے حیران ہوتے ہیں۔ مجھے ان سب چیزوں کے بدل جانے کا تو افسوس نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرا راموحجام ان دنوں کیا کرے گا؟ ان دنوں نہ وہ سر کے بال کاٹ سکے گا نہ شیو بنا سکے گا۔ پھر وہ بے چارہ کرے گا کیا۔؟ میرا خیال ہے آج سے دو ہزار سال بعد آپ کو اس دنیا میں حجام کہیں نہیں ملیں گے۔ ناخنئے ملیں گے جو آپ کے ناخن تراشا کریں گے۔ اس وقت خدا ہر گنجے کو ناخن دے گا۔ جن پر رنگا رنگ کی مالش کی جائے گی۔ اس وقت ناخنئے ہوں گے۔ اور مالشیے ہوں گے جو آپ کی کھوپڑی کی مالش کرتے کرتے اسے آئینے کی طرح چمکا دیں گے اور گودنے والے آرٹسٹ ہوں گے۔ جو عورتوں کی چندیا پر ایسی خوبصورت تصویریں گودا کریں گے۔ کہ جنھیں دیکھتے ہی مرد ان پر عاشق ہو جائے۔ یعنی آج کل کے مصور اس زمانے کے حجام ہوں گے۔ اور جو آمدنی آج کل کے حجاموں کو ہو رہی ہے۔ وہ اس زمانے میں سب کی سب مصوروں کو حاصل ہوگی۔ آج کل مصوری ایک عوامی آرٹ نہیں ہے۔ اس لیے مصور

بھوکا مرتا ہے۔ لیکن آج سے دو ہزار سال بعد جب عورتیں اپنی چندیا گدوانے کو فیشن میں داخل کر لیں گی اس وقت اس آرٹ کو صحیح فروغ حاصل ہوگا۔ اور مصور اپنے صحیح مرتبے کو پہنچے گا۔ ہر شہر میں بڑے بڑے سیلون ہوں گے جن کے اوپر چندیا گدوانے کا سیلون۔

(صرف خواتین کے لیے)

چندیا گدوانے کے ایک سو فیشن۔ اندر آ کے ملاحظہ کیجیے۔ ہمارے ہاں ماہر فن کام کرتے ہیں۔

مستقل چندیا گدوائی ـــــ دس روپے

پندرہ روزہ ـــــ دو روپے

سات رنگوں والی تصویر گدوانے کے لیے ـــــ آٹھ روپے

تین رنگوں والی ـــــ تین روپے

پنسل سے خاکہ ـــــ آٹھ آنے

ہمارے ہاں چندیا ہاتھ سے گودی جاتی ہے

لیکن

ملاک پرنٹنگ اور آف سیٹ کا بھی انتظام ہے۔

خوبصورت چندیا۔

خوبصورت عورت کا زیور ہے۔

بالوں کے ہونے نہ ہونے سے عورت اور مرد کے باہمی تضاد اور تفاوت میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اس لیے یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر عورتیں اپنی چندیا گدوائیں گی تو مرد نہیں گدوائیں گے۔ کوئی بہت ہی من چلا محبت کا مارا نکلا تو وہ اپنی محبوبہ کی تصویر اپنی چندیا پر گدوائے گا۔ لیکن وہ بھی مستقل رنگوں میں نہیں۔ کیوں کہ مستقل مزاجی مرد کا خاصہ نہیں ہے۔ عورتیں اپنے سر پر جب بھی دوپٹہ نہیں ڈالیں گی۔ لیکن مرد اپنی ٹوپی کو کبھی بھی خیر باد نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اور بھی زیادہ مضبوطی سے اپنے سر کے اوپر پہن لے گا۔ اور صرف اپنی خوابگاہ میں جا کے اس ٹوپی کو اتار دے گا۔ مرد کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔ اور عورت اسے اپنا حسن سمجھتی ہے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی کہ آج سے دو ہزار سال بعد عورتیں اپنے گنجے پن کی نمائش کرتی پھریں اور مرد نقلی بالوں کی ٹوپیاں پہن کر اور نقلی مونچھیں اور نقلی داڑھیاں لگا کر اپنی مردانگی کا ثبوت دینے لگیں۔

ایک وحشی بمبئی میں

خوب صورت بلند قامت مغربی عمارتیں، ہر ایک عمارت میں ہزاروں انسانوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ جنھیں عمارتوں میں گھونسلے بنانے کی اجازت نہیں یا توفیق نہیں۔ وہ باہر فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ دو کانوں کے بڑھے ہوئے لکڑی کے پائدان کے نیچے، محرابی پلوں کے نیچے جہاں پرندے بھی اپنا گھونسلہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن پرندہ اور انسان میں یہی تو فرق ہے۔ پرندہ آفاقی ہے انسانی ارضی، پرندہ آسمان کی پنہائیوں میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔ خدا جانے اسے کس بات کا ڈر ہے کس سے وہ اس قدر شرم محسوس کرتا ہے۔ کہ کبھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا، بلکہ گندے چیتھڑے لپٹائے، اپنے فاقہ زدہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا، کسی محرابی پل کے نیچے کسی ایسے تنگ و تاریک کونے کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ جس کی غلاظت اور تعفن میں وہ اپنا سر چھپا لے۔ اور تاروں کی نگاہوں، اور مون سون کی خشک ہوا اور چاند کی گہری دھندلی چاندنی سے اس خوفناک ارادے کا اظہار نہ کر سکے۔ جو ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے چھپا ہوا ہے مستور بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ لیکن جس کا اقرار اس قدر مشکل ہے کہ اس کا ضمیر ہر وقت پراگندہ رہتا ہے۔ اس کی روح پریشان اور جسم کا ہر تار ایک دکھتا ہوا زخم۔ کاش وہ کبھی تو قبولے۔ ایک بار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھل کر اس ازلی دشمنی اور نفرت کو اپنے آپ ظاہر کر دے۔ جو اسے دوسرے انسانوں سے ہے۔ شاید اس کے جسم سے وہ گندے چیتھڑے اس طرح جھڑ جائیں گے، جیسے درخت سے پرانی چھال اور وہ زندہ و تابندہ ہو جائے گا۔ لیکن وہ یہ کیسے کرے وہ تو ہر وقت کسی تاریک ونگ کونے کی تلاش میں رہتا ہے وہ تاروں کی نگاہوں کا پیغام نہیں سننا چاہتا۔ وہ رومانی نہیں۔ حقیقت پسند ہے۔

اور جو لوگ بمبئی کے بلند گھونسلوں میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے جسموں کے گرد چار دیواری کھڑی کر لی ہے۔ اور اس چار دیواری کو مختلف سازوسامان سے بھر لیا ہے۔ اس طرح کہ حرکت کرنا مشکل ہو جائے۔ وہ واقعی حرکت کرنا نہیں چاہتے۔ اوّل تو یہ چار دیواری ہے۔ پھر اس میں پلنگ ہے۔ میز ہے، کرسیاں ہیں، صوفے ہیں، کتابوں کی الماریاں ہیں چھوٹی چھوٹی بے شمار اشیاء ہیں جو انسان کو حرکت سے روکتی ہیں۔ اسے سوچنے سے روکتی ہیں۔ اسے سب پھندے تڑا کر بھاگنے سے روکتی ہیں۔ وہ بلند گھونسلے میں رہتا ضرور ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں بھی ایک ایسی لفٹ لگی ہوتی ہے۔ جو اسے اوپر لے جانے کے بجائے اسے ہمیشہ اسی تاریک کونے کی طرف لے جاتی ہے۔ جہاں ایک گندے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا ہے۔ اس کے دل کا چور، اس کی روح کی خوفناک کش مکش، اس کے ہاتھ کی انگلیوں کا پیہم اضطراب ہر لحظہ اس خاموش جنگ کا پتہ دیتا ہے۔ جو اس کی ہستی کے حدود اربعہ میں جاری ہے۔ قبولو۔ نہیں میں ہرگز نہیں قبولوں گا۔ میں ایک شریف انسان ہوں۔ اچھا سب سے اچھا انسان۔ میں نے کبھی دوسرے انسان پر کبھی کوئی ظلم نہیں کیا۔ اگر میں ایک بلند گھونسلے میں رہتا ہوں۔ تو یہ گھونسلہ میں نے اپنی محنت سے بنایا ہے۔ اپنی محنت اور عقل سے۔ ریس اور سٹے سے نہیں نہیں میں ہرگز نہیں قبولوں گا۔ اور پھر وہ پریشانی سے ٹیلی فون کے ریسیور کو پکڑ لیتا ہے۔

"ہیلو ہیلو ڈارلنگ۔ ہاں کہیں چلوں، ضرور چلو، سینما یا جو ہو آج طبیعت

پریشان ہے۔ جی نہیں لگ رہا ہے۔ ہاں ہاں وسکی ضرور ہوگی۔ غم غلط ہو جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سا غم ہے جو ہر انسان کے جی کو لگا ہوا ہے۔ جو ہر وقت اسے پریشان رکھتا ہے۔ بلند گھونسلوں میں رہنے والوں کو بھی پریشان کیے رکھتا ہے...... خدا کے لیے ایک بار بتا دو۔ دیکھو پھر کیا ہوتا ہے۔

بمبئی کے تین طرف سمندر ہے۔ اور ایک طرف کارخانے۔ یا تین طرف کارخانے اور ایک طرف سمندر لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان چہار اطراف پر کارخانے والوں کا قبضہ ہے پہلے پہل سمندر بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے، نیلا نیلا آسمان کی طرح معصوم۔ خوشی سے گنگناتا ہوا۔ کسی الھڑ دوشیزہ کے گیت کی طرح لیکن ایک عرصے کے بعد اس کی سب ادائیں، اس کے عشوے ناز و نخرے مصنوعی، جعلی اور پُرفریب معلوم ہوتے ہیں۔ بمبئی کا سمندر بمبئی کے کارخانہ داروں کی طوائف ہے اس کے گرد کنکریٹ کے بنچوں کا جنگل ہے۔ جہاں بیٹھ کر لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے رقص سے محظوظ ہوتے ہیں۔ تیرنے کی خاص جگہیں ہیں۔ جہاں آدمی پیسے خرچ کر کے تیر سکتا ہے۔ ایک جگہ پر ہندوستانی نہیں تیر سکتے۔ ایک جگہ پر صرف ہندو تیر سکتے ہیں۔ ایک جگہ پر صرف پارسی، سمندر کارخانے داروں کے جہاز اپنی چھاتی پر تیرا کر لاتا ہے۔ کنارے بڑے بڑے گودام ہیں۔ جہاں مال کی حفاظت ہوتی ہے اور پھر کسٹم کی چوکی ہے۔ اور پولیس کے سپاہی ہیں۔ ایک جگہ گیٹ آف انڈیا ہے۔ یعنی ہندوستان کا دروازہ۔ یہ دروازہ تاج محل ہوٹل کے بالکل قریب ہے۔ لیکن اب اس دروازے کو بھی لوہے کے تالوں سے بند کر دیا گیا ہے۔ اور اب یہ خوبصورت سمندر ایک ڈیرے دار طوائف بن کر رہ گیا ہے۔ اُمراؤ جان ادا........

بمبئی میں بڑی حرکت ہے۔ زندگی ہے۔ اضطراب ہے۔ بھاگتی ہوئی موٹریں ہیں جو پٹرول راشننگ کے باوجود دن میں سینکڑوں میل کا چکر لگاتی ہیں۔ بسیں ہیں۔ لاریاں ہیں ٹرامیں ہیں۔ لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا رہے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں۔ کیوں کہ کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ نگاہ اٹھا کر کسی دوسرے انسان کو پہچان لے۔ بہت سے لوگ بمبئی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ ہائے کس قدر بے بسی ہے۔ اس تنہا انسان کی، اپنی تنہائی اور بے بسی اور بے چارگی کو بھی ایک خوبی سمجھ لیا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھونسلے کی فکر میں ہیں۔ اشتراک کا فقدان، آزادی کی تشنگی کو بجھانے کے لیے مجبور ہے۔

لیکن یہ حرکت محض چند میلوں تک ہے۔ مینڈک کے کنویں کی طرح بمبئی کی چار دیواری بھی بے حد محدود ہے، کارخانے اور سمندر، اور اس چار دیواری کے اندھے کنویں میں لاکھوں انسان شب و روز مینڈک کی طرح خوشی سے چکر لگاتے ہیں۔ دادر سے چوپاٹی اور چوپاٹی سے کلو اسکوائر تک گھومتے ہوئے۔ اس حرکت پر بڑے مسرور ہوتے ہیں۔ وہ ایک وسعت ہے۔ کیا کشادہ سڑکیں ہیں۔ کیسی عمدہ صفائی ہے۔ دوکانوں پر بڑی بڑی شیشے کی الماریاں سجی ہیں۔ بس یہ کنواں ہماری کائنات ہے۔ اس کے بعد دنیا ختم اور کائنات خاموش.....

بمبئی کی سوغات ہے۔ فلم، سٹہ، کارخانے، ریس اور چائے۔ بمبئی میں ہر ذی ہوش چائے پیتا ہے۔ فلم دیکھتا ہے۔ ریس پہ جاتا ہے۔ اور کارخانے میں کام کرتا ہے۔ یا کام نہ کرتے ہوئے بھی کسی کارخانے کا مالک ہے۔ یا ان کے منافع کا شریک ہے۔ بمبئی میں ہر چوتھی دوکان چائے کی دوکان ہے۔ ہر آٹھواں گھر سینما گھر ہے۔ ہر بارھواں فرد ایکٹر ہے یا فلم ایکٹر ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ اور سٹہ اور ریس تو زندگی کے ہر شعبے میں چھائے ہوئے ہیں۔ جب تک دن میں بمبئی والا ایک بار ریس نہ دیکھ لے یا سٹہ نہ کھیل لے۔ وہ رات کو سو نہیں سکتا۔ کیوں کہ ابھی اسے کل کے سٹے کی فکر کرنا ہے۔ رکسی میں فلم دیکھنا ہے۔ جس کا ہیرو اس کے آئینے کی طرح جھوٹا ہے....... اور جس کی ہیروئن اس کے خوابوں

کی طرح باوفا اور حسین اور پھر چائے، چائے، چائے لادو۔ اور چائے لادو۔ بمبئی والے کی جنت میں چائے کی نہریں بہتی ہیں اور روشوں پر فلم ایکٹریسیں محو خرام ہیں۔ اور ہر وقت ریس لگی رہتی ہے۔ گولڈن ایرو، ڈبل ٹوٹ بہرام پلیٹ، واہ، واہ۔ اس جاکی نے تو غضب کر دیا۔

اور کارخانے۔ بمبئی والوں نے جن جنتی کارخانوں کا تصور کر رکھا ہے۔ ان کی چمنیوں سے کبھی دھواں نہیں نکلتا ان پر ایک پیسہ بھی اپنی گرہ سے خرچ نہیں کیا جاتا۔ مزدور کبھی اسٹرائیک نہیں کرتے۔ اور چپ چاپ سارا منافع کارخانے کے مالک کے قدموں پر ڈھیر کر دیتے ہیں......

گو بمبئی میں لوگ ایک دوسرے کو قطعی نہیں پہچانتے، لیکن یوں وہ سب بھائی بھائی ہیں۔ شاید صحیح اخوت اور مساوات یہی ہے کہ انسان دوسرے انسان کو نہ پہچانے اسی لیے تو بمبئی میں ہر شخص نے اپنے نام کے آخر میں بھائی لگا رکھا ہے۔ یہ جوسف بھائی ہیں۔ یہ جعفر بھائی ہیں۔ یہ جمشید بھائی ہیں۔ یہ سارا بھائی ہیں۔ یہ آدھا بھائی ہیں۔ یہ اشا بھائی ہیں۔ یہ سیدھا بھائی۔ مگر ہر فرد بھائی ضرور ہے۔ وہ آپ کو پہچانے گا نہیں، چائے تک نہیں پلائے گا۔ جس سڑک پر آپ چلے جا رہے ہیں اس کا نام تک نہ بتائے گا۔ اگر ہو سکے تو آپ کی جیب تک کاٹنے کو تیار ہوگا۔ مگر وہ آپ کا بھائی ضرور ہے۔ آپ کا جوسف بھائی یا جاکی بھائی۔ بمبئی کا بھائی۔ ہر اس شخص کے لیے جو بمبئی میں پہلی بار وارد ہوتا ہے ایک اچنبھا ہے اور شاید ایک مصیبت بھی۔!

بمبئی والوں کے دو تکیہ کلام ہیں۔ "چالو اور خلاص" یہاں ہر چیز چالو ہے یا خلاص۔ کیوں صاحب یہ فیتہ بوٹ باندھنے کا آپ کے خیال میں کیسا رہے گا۔

"چالو۔"

یہ فلم کیسا ہے۔ "چالو"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ فلم ایکٹریس کیسی ہے۔ "چالو۔"

یہ ڈاکٹر کیسا ہے۔ "چالو۔"

رات کے دس بجے جب بمبئی پر بلیک آؤٹ کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے۔ صرف کہیں کہیں بجلی کی بتی کسی مجرم کی آنکھ کی طرح خوفناک ارادے کا اظہار کرتی ہے۔ آپ سینما سے لوٹتے ہوئے کسی قریب کے ہوٹل میں گھس جائیے۔

"آئیے بھائی۔" ہوٹل والا اپنے چہرے اور اپنی گھنی مونچھوں پر ایک مشفقانہ تبسم پھیلاتے ہوئے کہے گا۔

"کھانا چاہیے بھائی۔" آپ بھوک سے بے تاب ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بلک کرتے ہوئے کہیں گے۔

"خلاص۔" (بمعنیٰ لا نفی)

"اچھا تو چائے ہوگی۔؟"

"خلاص۔!"

"کافی ہے۔؟"

"خلاص۔"

"اُلّو کا پٹھا ہے۔"

"خلاص۔"

اگر آپ کسی بمبئی والے سے اچانک سوال کر بیٹھیں کیوں صاحب خدا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ تو اگر اس نے ریس یا سٹے میں کچھ جیتا ہے تو کہے گا "چالو!" ورنہ "خلاص!" کیوں کہ خدا تو ہر شخص کا ذاتی ہوتا ہے۔ اور بمبئی والوں کے خدا کی شکل تو ریس کے کسی دُبلے پتلے پچکے ہوئے گالوں والے گنجے جاکی سے ملتی جلتی ہے۔!

بمبئی میں تجارت ہوتی ہے۔ محبت نہیں ہوتی۔ ایکٹر ہوتا ہے۔ آدمی نہیں ہوتا۔ لفٹ ہوتی ہے۔ گھر نہیں ہوتا۔ بمبئی ایک عجیب جگہ ہے۔ یہاں

ہندوستان کے سب مذہب، سب قومیں، سب لباس، سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بمبئی کی کوئی ایک زبان نہیں، ایک تمدن نہیں۔ ایک رواج نہیں — وہ ہندوستان کا مرکز ہے۔ اور اس کی ملنساری اس کے نفاق اور اس کی عظیم ذلّت کا پرشکوہ منظر۔ جب بلیک آؤٹ ہوتا ہے اور جوسف بھائی کی آنکھ بند ہوجاتی ہے۔ اور بند گھونسلوں میں بجلی کی بتیاں گُل کر دی جاتی ہیں۔ اور سمندر کے کنارے کسی پُرشکوہ ہوٹل میں ایک بے کار سیٹھ اپنے شرابی سانس کو کسی خریدی ہوئی فلم ایکٹریس کے رخساروں پر دھونکنی کی طرح بکھیرنے لگتا ہے۔ اسی وقت سمندر کے کنارے میرین ڈرائیو کی لمبی فضا میں کسی بھوک کے بلکتے ہوئے فقیر بچے کی جگر خراش چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ بھوکا ہے اس کی نیپالی ماں بھوکی ہے۔ اور غیظ و غضب میں آکر وہ اسے بے تحاشہ پیٹنے لگتی ہے۔ کیوں کہ آگ اور پانی اور ہوا اور روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے چھال۔ یہ سب چیزیں جو پہلے قدرت مفت مہیا کرتی تھی۔ اب قانونی اور سرمایہ کے جیل میں بند کر دی گئی ہیں۔

"ماں لوتی۔"

"چپ سور۔"

"ماں لوتی۔"

"چُپ حرامی لنگور۔"

"ماں لوتی۔"

"چپ گنجے گیدڑ۔"

نیپالی بھکارن نیپالی زبان میں اپنے بچے کو مخصوص صلوتیں سنا رہی ہے۔ اور یکایک مجھے احساس ہوتا ہے، انسان کی ابھی صرف دُم جھڑی ہے — میں بدستور وحشی ہوں۔ ایک جاہل، بے عقل حیوان جس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنا درک، اتنا سلیقہ، اتنی خوش معاملگی بھی نہیں ہے۔ جتنی چیونٹیوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گروہ میں یا ہرنوں کے گلے ہیں۔

بمبئی انسانوں کا شہر نہیں ہے۔ وہ ایک جنگل ہے ایک خوفناک وحشی جنگل، جس میں چیتے، لنگور، گیدڑ، سانپ لومڑیاں، بھیڑیے بستے ہیں۔ اور اس جنگل کی خوفناک تنہائیوں میں وہی اکیلی۔ المناک صدا۔ ماں لوتی۔!

ماں لوتی۔!

ماں لوتی۔!

ماں لوتی۔!

خلاص۔!!!

☆☆

اخباری جوتشی

آزدی سے پہلے ملک کے راجہ مہاراجہ لوگ اپنے درباروں میں شاہی جوتشی رکھا کرتے تھے۔ جو صرف شاہی خاندان کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد جب لوگوں نے شاہی........ خاندانوں کی قسمت ختم کر دی تو بہت سے راج جوتشی بیکار ہو گئے۔ ان میں سے ایک میرے والد بھی تھے اور گو میں راج جوتشی نہیں تھا لیکن راج جوتشی کا بیٹا ضرور تھا۔ اگر لوگ باگ راجاؤں مہاراجاؤں سے ذرا زیادتی نہ کرتے تو ان کی گدی کے ساتھ میری گدی بھی برقرار رہتی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور مجھے ناچار ڈونگا سنگھ بونگا سنگھ اینڈ سنز کے ہاتھ کلرکی کرنی پڑی۔

مگر میرا جی کلرکی میں نہیں تھا۔ میں اِدھر اُدھر ٹوہ لیتا رہتا تھا۔ کہ کہاں پر کس کو کسی راج جیوتشی کی ضرورت ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ جتنے بڑے بڑے اخبار ہیں وہ راج جوتشی ملازم رکھ رہے ہیں۔ اور کئی ایک بڑے بڑے وزیر بھی ایسے ہیں جو غیر سرکاری طور پر جوتشیوں کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ دل میں بہت خوش ہوا۔ اور جونہی روزنامہ دیش بھگت میں راج جوتشی کی ضرورت کا اشتہار پڑھا۔ میں بھی اس کے سامنے جا بیٹھا اور پن ہولڈر رکھانے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو آپ راج جوتشی ہیں؟" ایڈیٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں میں راج جوتشی ہوں اور لوک جوتشی بھی ہوں۔ میں ہر سیاسی پارٹی کی کنڈلی بنا سکتا ہوں۔ اس کی جائے پیدائش اور اس کی موت کا صحیح صحیح وقت بتا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں چاندی، سونے، لوہے، پیتل اور روئی کا جوتش بھی جانتا ہوں۔"

"جب تو آپ ہمارے کمرشیل صفحے کے لیے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔" چیف ایڈیٹر نے جم کپ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی عنایت ہے۔" میں نے خوش ہو کر سیاہی حلق میں انڈیل لی۔ اور ہونٹوں کی سیاہی چوس سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

سنیچر کا دن سر پر آگیا۔ اور میں نے ابھی تک اپنی رپورٹ تیار کر کے پریس میں نہیں دی تھی۔ چیف ایڈیٹر نے دو تین بار یاددہانی کرائی۔ میں نے کہا۔

"آپ اخبار روک کے رکھیے۔ میں سخت محنت کر رہا ہوں۔ بس زائچہ تیار ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔ ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا۔ ایسی عمدہ رپورٹ بناؤں گا کہ بڑے بڑے راج جوتشی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

اسی اثنا میں ادھر ادھر بہت گھوما۔ دو ایک کتابیں بھی پڑھیں، جوتش پر۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر جیسے تیسے بھی بن سکا میں نے زائچہ تیار کر کے بھیج دیا اور کمرشل نوٹ بھی لکھا اور ریس کے لیے بھی ٹپ نکال کے بھیج دیے۔

آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

کمرشیل نوٹ :-

اس ہفتے میں بازار میں مندا رہے گا۔ تھوڑی سی سرگرانی ہوگی۔ لیکن جلد اتر جائے گی۔ لوہا تانبے سے ٹکرائے گا لیکن پھر الگ ہو جائے گا۔ مونگ کی دال آلو کی بھاجی اور پاپڑ کا بھاؤ تیز ہوگا۔ لیکن پٹرول کا گیلن آدھا ہو جائے گا اور پھر ایک دم لیٹ جائے گا۔ جس سے بازار میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے۔

بیوپاریوں کو چاہیے کہ اس موقع پر فائر انجن منوا کے رکھیں۔

ٹاٹا ڈیفرڈ، ڈالمیا بسکٹ، برلا ہندوستان نمبر دس اور بھائی دھارا سنگھ کے اچار شلغم کے حصے اونچے ہو جائیں گے۔ چاندی سونے کے بھاؤ پر مہنگی اور سونا گندم کے بھاؤ پر، اور گندم کسی بھاؤ پر بھی دستیاب نہ ہوگی۔ یہ سارا ہفتہ اسی طرح جانے لگا۔ اور ممکن ہے کہ سارا سال اسی طرح جائے۔ لیکن فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ سرکار اپنی ہے اور ہندوستان کا ستارہ اس وقت مشتری کے گھر میں ہے جس کا اختری فیض آبادی سے کوئی تعلق نہیں۔

روئی کا بھاؤ گر جائے گا۔ کپڑا مہنگا ہو جائے گا۔ گنے کا بھاؤ سستا ہو جائے گا....... لیکن کھانڈ مہنگی ہو جائے گی۔ اس ہفتے جو بیوپاری سفید چیز کا بیوپار کرے گا۔ اسے بڑا فائدہ ہوگا۔ چاہے وہ سفید لٹھا بلیک مارکیٹ میں فروخت کرے یا برما کا سفید ہاتھی پالے ہر صورت میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس ہفتے کے چھ دنوں میں کارخانوں میں ہڑتال رہے گی۔ ساتواں دن اتوار کا ہوگا۔ جس دن چھٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاک ایکسچینج کے باہر گھومنے والے سانڈوں کی پوجا کرنے سے اور ان کے منہ میں تمباکو والا پان ڈالنے سے یہ سنکٹ جاتا رہے گا۔

ریس کے ٹپ

از

ریس کے رسیا

اس ہفتے کا لکی دن پانچواں ہے۔ اس لیے آنکھ بند کر کے پانچواں ریس کھیلیے۔ اور اس میں پانچویں نمبر کے گھوڑے پر اپنی ساری جائداد لگا دیجیے۔

تیسری اور آٹھویں ریس بالکل نہ کھیلیے۔ سب گھوڑے اور سب جاکی بکے ہوئے ہیں اور گھوڑے کے مالک ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ پبلک کو الو بنائیں گے۔ اور لاکھوں روپیہ لوٹ لیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوتھی ریس میں گوالیار اور کشمیر دوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جیت سیٹھ مھوندو لعل کے گھوڑے "تامی" کی ہوگی۔ اور اگر "تامی" نہ جیتا تو "حرامی" تو ضرور جیتے گا۔ ون اور پلیس دونوں کھیلیے۔

پہلی اور دوسری ریس کے سب گھوڑے اچھے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کو ہرا نہیں سکتا۔ آپ کوئی سا گھوڑا کھیل دیجیے۔ جیت جائے گا۔ اور اگر نہ جیتے تو ایک ریوالور اپنے پاس رکھیے۔ پہلی فہرست میں لبلبی دبا کر خودکشی کیجیے۔

چھٹی ریس میں "ہندوستان" اور "پاکستان" بہت اچھے گھوڑے ہیں بہتر ہوگا کہ ہندو "ہندوستان" کھیلیں اور مسلمان "پاکستان"۔ لیکن یہ دونوں گھوڑے آنے والے نہیں ہیں۔ اس ریس میں ساتویں نمبر کا جو گھوڑا ہے دوڑ رہا ہے۔ اس کا نام ہے۔ ماؤنٹ بیٹن۔ بس یہی گھوڑا آخر میں جیتے گا۔ اس جیت سے پہلے ریس کورس میں ہندو مسلم فساد بھی ہو سکتا ہے۔

ساتویں نمبر میں نو نمبر کا گھوڑا سب سے اچھا ہے۔ لیکن تین نمبر بھی برا نہیں۔ آخری فرلانگ تک یہ دونوں گھوڑے برابر چلے آئیں گے۔ لیکن آخر میں وہی گھوڑا جیتے گا جس کے مالک نے اسے زیادہ شراب پلائی ہوگی۔ کس گھوڑے نے زیادہ شراب پی ہے۔ اس کا اندازہ اصطبل کے لوگوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ جوتشی اس سے زیادہ آپ کو کیا بتا سکتا ہے۔

نویں ریس میں سب گھوڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ ان کے نام فلم اسٹاروں کے سے ہیں۔

نرگس، ثریا، نورجہاں، حفیظ جہاں، حسن بانو اور مدھواٹیڈوانی حالاں کہ موخر الذکر ایک مرد ایکٹر کا نام ہے۔ لیکن گھوڑے کے مالک نے شاید اسے بھی ہیروئن کا نام سمجھ کے اپنی گھوڑی کا نام رکھ دیا ہے۔ خیر اس سے ہماری جوتش میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اس ریس میں چندر ریکھا گھوڑی جیتے گی۔ کیوں کہ یہ ابھی ابھی سرکس سے

آئی ہے۔

اس ہفتے آپ کی کنڈلی کیا کہتی ہے:۔

سوم وار:۔

آپ دیر میں بستر سے اٹھیں گے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہوگا جو اسپرو کھانے سے جاتا رہے گا۔

دن اچھا گزرے گا۔ دفتر میں ہیڈ کلرک سے لڑائی ہوگی۔ لیکن فرم کا مالک آپ کی طرفداری کرے گا۔ شام کے چھ بجے آپ ضرور کوئی خوش خبری سنیں گے۔

منگل وار:۔

کوئی گم شدہ خزانہ ملے گا۔ بیوی سے لڑائی ہوگی۔ میٹنی شو میں آپ ایک خوب صورت لڑکی دیکھیں گے۔ جس کے ساتھ اس کا خاوند ہوگا۔ اور آپ اس سے کوئی بات نہیں کر سکیں گے اور کلیجہ پکڑ کر رہ جائیں گے۔ رات کو گھر لوٹتے ہوئے ٹرام کا کنڈیکٹر آپ کی بے عزتی کرے گا۔ صبح چائے کے ساتھ آلو کی بھجیا ملے گی۔ رات کو فاقہ ملے گا۔ مگر بیچ کے دن کا وقت بڑے مزے میں بسر ہوگا۔

بدھ وار:۔

آپ کا چیک DISHONOUR ہوگا۔ پولیس حراست میں رکھے گی۔ شام کو آپ کی بیوی کا بھائی ضمانت دے کر چھڑا کر لائے گا۔ یہ بہت برا دن ہے آپ کے لیے لیکن رات بہت اچھی گزرے گی۔ گھر میں کھانا بھی اچھا ملے گا۔ سر میں تیل کی مالش بھی ہوگی۔ اس روز اگر آپ کے گھر سے باہر نہ نکلیں تو اچھا ہے۔ ورنہ آپ کی مرضی۔

جمعرات:۔

راج دربار میں عزت ہوگی۔ کوئی نیا محبوب ملے گا۔ دوپہر کے وقت آپ بازار میں تاش لینے کے لیے جائیں گے۔ اور پھر کسی موٹر کے نیچے آ کر مر جائیں گے۔

جمعہ:۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمعرات کو اگر آپ نہیں مرے تو جمعہ کی صبح کو ناشتے پر آپ تیتر کے کباب کھائیں گے۔ اور اگر آپ سبزی خور ہیں تو مونگ کی دال کے کوفتے۔ اخبار میں آپ ضرور کوئی بُری خبر پڑھیں گے جسے پڑھ کر آپ کو بڑا صدمہ ہوگا۔ جو ایک پیگ برانڈی سے دور ہو جائے گا۔ اسی روز آپ کے چھوٹے بچے کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی ورنہ دن بھر اچھا گزرے گا۔ آپ کی بیوی ایک نئی ساڑھی کا تقاضہ کرے گی۔

سنیچر:-

آپ صبح راشن لینے جائیں گے۔ لیکن دوکان بند ملے گی۔ کپڑے کے کوپن لینے جائیں گے۔ لیکن دفتر بند ہوگا۔ ریس کھیلنے جائیں گے اور بہت سارا پیسہ ہار کے آئیں گے۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر فرسٹ کلاس میں بیٹھیں گے اور ٹکٹ چیکر آپ کا چالان کر دے گا۔ لیکن آپ پیسے ادا کر کے چھوٹ جائیں گے۔ اور اسی روز ہمسایوں سے لڑائی کا خطرہ ہے۔ لیکن ہاتھ جوڑ دینے سے یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ بزنس میں ترقی ہوگی۔ دل کھول کے سٹہ کھیلیے اور بلیک مارکیٹ کیجیے۔ یہ دن بلیک مارکیٹ کے لیے بہت اچھا ہے۔

اتوار:-

آپ کو اچانک دفتر میں بلا لیا جائے گا۔ آپ کی چھٹی کے سارے پروگرام ختم ہو جائیں گے۔ آپ دفتر میں لڑیں گے۔ اور گھر پر بیوی بچے آپ کو گالیاں دے رہے ہوں گے۔ شام کو آپ گھر جاتے ہوئے بچوں کے لیے دو کیلے دو امرود اور ایک سنگترہ خریدیں گے۔ اور کوئی من چلا آپ کی جیب کترے گا۔

لیکن جو لوگ اتوار کے دن پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے لیے بہت اچھا ہے۔ وہ سو سال تک جئیں گے۔ جس میں پہلے ۵۰ برس گھر میں اور دفتر میں بسر ہوں گے اور اگلے پچاس برس پاگل خانے میں!

"دیش بھگت" کا پرچہ جب اتوار کے روز بازار میں آیا تو دس منٹ میں

سب بک گیا۔ ایک کاپی بھی نہیں رہی۔ دوسرے دن اخبار کے دفتر کے باہر اخبار پڑھنے والوں کا جم غفیر جمع تھا۔ وہ لوگ دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن پولیس کی مدد سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔

چیف ایڈیٹر اور دوسرے مدیروں نے مل کر میری ٹھکائی کی۔ چنانچہ یہ مضمون میں آپ کو ہسپتال سے لکھ کے روانہ کر رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہوں گے میرا جوتش سو فیصد سچا نکلا۔ اتنا سچا کہ لوگ اسے برداشت نہ کر سکے۔ لوگ اخباری جوتشی کے پاس سچائی ڈھونڈنے نہیں جاتے۔ اپنے بھولے خواب دیکھنے جاتے ہیں۔ یہی میری غلطی تھی۔

❖ ❖ ❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلتا پُرزہ

مسٹر چلتا پُرزہ سے میری ملاقات بہت پُرانی ہے۔ اتنی پُرانی کہ وہ بچپن کے دنوں تک جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ بلکہ صرف آنگن میں گھٹنوں کے بل گھسٹ کے چلتا تھا۔ اور آنگن کے فرش پر پڑی ہوئی ہر چیز کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑ کے اسے مُنہ میں ڈالنے کی فکر میں رہتا تھا۔ ان دنوں اچانک میری ملاقات مسٹر چلتا پُرزہ سے ہو گئی۔

وہ بات یوں ہوئی کہ میں سردیوں کی کھلی دھوپ میں روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے اور دودھ کی کٹوری سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ اور اس بات کا ارادہ کر رہا تھا کہ روٹی کے ٹکڑے کو دودھ میں بھگو کے کھاؤں کہ اتنے میں مجھے سامنے کی دیوار پر ایک ہرے رنگ کا طوطا نظر آیا۔ اور اس کی طرف دیکھ کے پہلے مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ یہ طوطا مجھے بہت اچھا لگا۔ طوطے نے کہا: ٹیں ٹیں یعنی کہو بدھو میاں اچھے تو ہو۔ اور میں زور سے ہنس دیا۔ اس کے بعد طوطے نے اپنے خوبصورت پر پھیلائے اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ اور میں گردن اونچی کر کے اُوپر آسمان کی طرف اس کی اُونچی اُڑان کو حیرت سے تکتا گیا کہ اتنے میں ایک تاریک سایہ بالکل میرے قریب سے گزر گیا۔ اور میں پلٹ کے دیکھتا ہوں کہ ایک کالے

رنگ کا کوا میری روٹی کا ٹکڑا چونچ میں دبائے لیے جا رہا ہے۔

میں حیرت سے کبھی اس کی چونچ کی طرف اور کبھی اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر مجھے رونا آ گیا اور میں مُنہ بسور کر رونے لگا۔ کیوں کہ کوا دیوار پر میرے سامنے بیٹھا میری روٹی کا ٹکڑا کھا رہا تھا۔ ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔ مسٹر چلتا پُرزہ سے پہلی پہلی ملاقات کے بعد ہمیشہ رونا آتا ہے۔ بعد میں ہنسی بھی آتی ہے۔ لیکن پہلی بار ہمیشہ رونا آتا ہے۔

تو یہ تھی مسٹر چلتا پُرزہ سے میری پہلی ملاقات۔ ایک کوے کے بھیس میں وہ میرے سامنے آیا اور میری روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر چلتا بنا۔ اس کے بعد بھی مسٹر چلتا پُرزہ سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کا حال میں ابھی بیان کروں گا۔ لیکن اس پہلی ملاقات کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے بعد مسٹر چلتا پُرزہ کئی بھیس بدل کر میرے سامنے آتا رہا۔ لیکن میرے ذہن میں اس کی ہمیشہ وہی صورت اجاگر رہی۔ اور میرے نزدیک مسٹر چلتا پُرزہ کی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ ایک کالا کوا ہے۔ جو آپ کی روٹی کا ٹکڑا چھین کے آپ کے سامنے کھاتا ہے۔

بچپن میں کبھی یہ کالا کوا ہوتا ہے۔ کبھی سُرخ بندر ہوتا ہے۔ کبھی بلّی کی طرح خرخر کرتے ہوئے بڑی چالاکی سے آپ کے پاس آتا ہے۔ کیوں کہ مسٹر چلتا پُرزہ بہت ہی چالاک ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان اور جانور کا بھیس بدل سکتا ہے۔

مسٹر چلتا پُرزہ سے میری دوسری ملاقات اسکول میں ہوئی ویسے تو ملاقاتیں بہت سی ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی کیوں کہ جب تک آدمی زندہ ہے۔ مسٹر چلتا پُرزہ سے نجات مشکل ہے۔ کیوں کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جب کہیں کوئی ایک بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا چلتا پُرزہ، اس کے ساتھ ہی کہیں آس پاس پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ زندگی میں دلچسپی قائم رہے اور دلچسپی مصیبت ہی سے آتی ہے۔ خوشی سے نہیں آتی، خوشی میں تو خالی خوشی ہی ہوتی ہے۔

ہاں تو میں مسٹر چلتا پُرزہ سے اپنی دوسری ملاقات کا حال بیان کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے میں نے ابھی کہا یوں تو مسٹر چلتا پُرزہ سے دن میں کئی بار ملاقات ہوئی ہے لیکن یہاں میں صرف ان ملاقاتوں کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں جو مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ اور جنھیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

اسکول میں ایسا اتفاق ہوا کہ یہ ایک گاؤں کا اسکول تھا۔ جس میں میں سب لڑکوں سے امیر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ میرے کپڑے سب سے اچھے ہوتے تھے۔ میری کتابیں سب سے زیادہ شاندار ہوتی تھیں۔ اور میرا بستہ دُھلا ہوا اور چمکتا ہوا ہوتا تھا۔ ایسے بچے کے ساتھ اسکول میں جو سلوک ہوتا ہے، اسے صفائی پسند ماں باپ نہیں جانتے۔ اور وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ان کا بچہ کیوں بغیر مُنہ دھوئے میلا بستہ ہاتھ میں لیے اسکول جانے پر مصر ہے۔ خیر چھوڑیے اس بات کو یہ تو ایک پرانی کہانی ہے کہ بچے ماں باپ کو نہیں سمجھتے۔ اور ماں باپ بچے کی تکلیفوں کا حال نہیں جانتے۔ اس لیے ان کے درمیان اکثر چلتا پُرزہ آجاتا ہے۔ اور کثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب تک ماں باپ اور بچے مل کر ان کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قایم نہیں کرتے۔ اس مصیبت سے چھوٹنا مشکل ہے۔

تو صاحب بات یہ نکلی، کہ اسکول میں میرے پاس بہت اچھے سفید رنگ کے کاغذ ہوتے تھے۔ اور ان پر میری لکھائی بہت بُری ہوتی تھی۔ میرے قریب جو لڑکا بیٹھتا تھا اس کے پاس اور کلاس کے دوسرے لڑکوں کے پاس بادامی رنگ کے پتلے پتلے کاغذ ہوتے تھے۔ جس پر وہ اس خوبصورتی سے الف، ب، ت لکھتے تھے کہ میں گھنٹوں ان کے خوشخط خط کو دیکھتا رہتا اور کڑھتا رہتا۔ آخر پریشان ہو کے میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے سے بڑے رازدارانہ لہجہ میں پوچھا۔ دوست بتاؤ تو سہی یہ کیا بات ہے۔ میرے کاغذ سب سے اچھے ہیں۔ میرا قلم سب سے اچھا ہے۔ پھر بھی میرا خط سب سے بُرا ہے وہ لڑکا میری طرف دیکھ کر ایک طنزیہ ہنسی ہنسا۔ پھر سنجیدہ ہو کے کہنے لگا۔

یہی تو تمھاری غلطی ہے۔ تمھارا کاغذ سب سے بُرا ہے۔ اور قلم بھی، اس چپلے بادامی کاغذ پر حروف بہت اچھے اُبھرتے ہیں اور تمھارا یہ خوب صورت قلم کس کام کا ہے۔ الف، ب، ت لکھنے کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔ تم ذرا میرے قلم کا خط تو دیکھو۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا بانس کا قلم میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سفید کاغذ اس کے پاس چلے گئے ہیں اور اس کے بادامی کاغذ میرے پاس آگئے ہیں۔ میری کانچ کی خوب صورت دوات اس کے پاس پہنچ گئی ہے۔ اور اس کی مٹی کی بھدی دوات میرا منہ چھانک رہی ہے۔ میرا انگریزی قلم اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کا بانس کا ٹوٹا ہوا قلم میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا میلا بستہ بھی میرے پاس آجاتا۔ اور میرا نیا بستہ اس کے پاس پہنچ جاتا۔ مگر وہ لڑکا خود ہی نہیں مانا۔ دراصل مسٹر چلتا پُرزہ بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے کہاں تک وار کرنا ہے اور کہاں پر روک دینا ہے۔ ایک جلاد میں اور چلتا پُرزہ میں یہی تو فرق ہے کہ کم بخت جلاد کو ہاتھ روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ لیکن چلتا پُرزہ کو ہے۔ اسی لیے میں اسے جلاد سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔

یہ جو سفید کاغذ کو بادامی کاغذ میں بدل دینے کا ہیر پھیر ہے۔ یہی دراصل مسٹر چلتا پُرزہ کے کرتب کی جان ہے۔ بڑے ہو کر یہی صاحب سونے کے ہار کو کاغذ کے کورے ورق میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ سو سو کے نوٹ کو دو دو سو کے نوٹ بنا دیتے ہیں۔ ایک تولے سونے کو دو تولے سونے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

آخر میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ہیرے مسٹر چلتا پرزہ کی مٹھی میں رہ جاتے ہیں۔ اور کوئلے اپنی مٹھی میں آتے ہیں جیسے اس دن اپنے ہاتھ میں اچھے کاغذوں کی بجائے بادامی کاغذ آگئے تھے۔ آج بھی جب اس واقعے کو گزرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اچھے کاغذ کا شوق باقی ہے۔ لیکن خط بدستور بُرا ہے۔ یعنی کوئلہ ہیرا نہ بن سکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالا ہوتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ کوئلوں کی دلالی میں دلال کا منہ کبھی کالا نہیں ہوتا، کالا ہوتا ہے تو اس آدمی کا جس کے ہاتھ سے سفید کاغذ جاتے ہیں اور بادامی کاغذ آجاتے ہیں۔

لیکن بچپن کے روٹی کے ٹکڑے اور لڑکپن کے سفید کاغذ کی حقیقت کیا ہے۔ یہ تو دو ایک مثالیں میں نے آپ کو اس لیے دی ہیں تاکہ آپ کو مسٹر چلتا پرزہ کا کردار معلوم ہو جائے جوانی میں اگر تو مسٹر چلتا پرزہ بہت سے پرزے نکالنے لگتا ہے۔ اور لاکھوں کا ہیر پھیر کرتا ہے۔ اور کروڑوں آدمیوں کی روٹی چھین لیتا ہے۔ اس کا دور گلی محلہ سے لے کر بازار تک اور بازار سے لے کر آفس تک اور آفس سے لے کر بڑی بڑی سلطنتوں تک ہوتا ہے۔

آج کے زمانے میں تو مسٹر چلتا پرزہ کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آج کے سماج کے کوئی پرزہ ایسا نہیں ہے جو مسٹر چلتا پرزہ کے بغیر چل سکے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ مسٹر چلتا پرزہ موجود نظام زندگی کا موجودہ چکر ہے۔ اور ہم لوگ محض گھن چکر ہیں۔ کہ جب کوا روٹی کا ٹکڑا لے کر اڑ جاتا ہے تو خالی واویلا مچانے کے سوا کچھ نہیں کرتے

میرے بچپن کا کوا اور میرے لڑکپن کا اُچکا اور آج کل کا مسٹر چلتا پرزہ بڑے مزے میں رہتا ہے۔ بھیس بدلنے کی تو اس کی پرانی عادت ہے۔ اور یہ کبھی جائے گی بھی نہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر وہ بڑے مزے میں آج کل رہتا ہے۔ اس کے پاس گاڑی موٹر، نوکر چاکر، بیوی، بنگلہ، فلیٹ، دولت عزت سب کچھ موجود ہے۔ زندگی میں آپ کو ایسے چلتے پرزے دکھائی دیں گے۔ جن کے سامنے ہم لوگ بالکل بیٹھے ہوئے پرزے معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن ایک بات میں مسٹر چلتا پرزہ ہمیشہ دوسرے لوگوں سے مات کھا جاتا ہے اور یہی ایک بات ہے جو عام لوگوں کو یعنی میرے اور آپ جیسے لوگوں کو مسٹر چلتا پرزہ چاہے وہ کسی روپ میں آپ کے سامنے کیوں نہ آن کھڑا ہو آپ اسے ہمیشہ پہچان سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنی گذر بسر دوسروں کی محنت سے کرتا ہے۔ یہ

ایک کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے اور چلتے پرزے کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کی اور کوئی دوسری پہچان نہیں ہے۔

دوسری پہچان بنانے والے آپ کو بہت سے لوگ ملیں گے۔ مگر یہ لوگ خود چلتے پرزے ہیں جو آپ کو غلط پہچان بتا کر دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ چلتے پرزے کی ایک قسم اور بھی ہے۔ جسے چلتا پرزہ کی بجائے چلتی پرزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چلتا پرزہ سے چلتی پرزی ہمیشہ زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ مگر یہ آج کا موضوع نہیں ہے اس لیے صرف اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

چلتے چلتے چلتے پرزے کا ایک آخری واقعہ آپ کو اور سنا دوں جو ابھی میرے ساتھ پیش آیا۔ تھوڑے دن ہوئے چلتا پرزہ میرے پاس آیا اور دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرکے اور بہت سی ہمدردی جتا کے مجھ سے کہنے لگا۔

"بھئی تم اس چھوٹے سے مکان میں کیسے گزر کرتے رہو گے۔ اس چھوٹے سے مکان میں۔"

اب تک مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں تکلیف میں رہتا ہوں۔ میرا خیال تھا، میں بہت مزے میں ہوں۔ لیکن بھلا ہو مسٹر چلتا پرزہ کا انھوں نے مجھے میری تکلیف کا احساس دلایا۔

میں نے کہا۔ "ہاں بھئی تکلیف تو ہے۔"

اس کے بعد مسٹر چلتا پرزہ نے کہا۔ "اور بھئی یہاں سے تو اسکول بہت دور ہوگا۔ تمہارے بچے کہاں پڑھنے جاتے ہیں۔"

میں نے یکایک سوچا واقعی یہاں سے بچوں کا اسکول تو دو میل دور ہے۔ بے چارے روز روز بس میں بیٹھ کر اتنی دور جاتے ہیں۔ اور ان ننھی جانوں کو اس سے کتنی کوفت ہوتی ہوگی۔ اس کا میں نے ابھی تک کوئی اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے فوراً بڑی گھبراہٹ میں مسٹر چلتا پرزہ سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھئی تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ بچّوں کا اسکول تو بہت دور ہے۔ کہیں اچھا سا مکان دلوا دو۔"

مسٹر چلتا پُرزہ غور کرنے کے بعد بولا۔ "ایک مکان تو ہے کولابے میں لیکن وہ مکان چھوڑنا نہیں چاہتے ایسے۔ وہ چاہتے ہیں۔ انھیں شہر سے باہر کہیں مکان مل جائے تو بدل لیں۔ انگریز میاں بیوی ہیں۔ شہر سے باہر رہنا پسند کرتے ہیں۔"

میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ "تو میرا مکان انھیں دیدو۔ بھئی یہ تو شہر سے کیا گاؤں سے بھی باہر ہے بالکل اجاڑ بیابان ہیں، درویشوں کی طرح رہتا ہوں۔ یہ مکان انھیں دیدو اور ان کا مکان مجھے دلوا دو۔"

وہ بولا۔ "بیچ میں صرف پانچ سو کی بات آن پڑی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی پانسو روپیوں کا کمروں میں رنگ کرایا ہے۔ وہ تم دیدو تو بات پکی سمجھو۔"

میں نے بات پکی کرنے کے لیے پانچ سو روپے اسی وقت دیدیے۔ ادھر وہ انگریز جوڑا بھی راضی ہوگیا۔ ہمارا مکان انھیں بے حد پسند آیا۔

ہم دونوں مسٹر چلتا پرزہ کے بہت احسان مند تھے۔

آخر ایک دن مکان تبدیل کرنے کا مہورت نکل آیا۔ قرار پایا کہ اس روز ہم لوگ کولابے جائیں گے۔ اور وہ لوگ دارسوا آجائیں گے۔ دونوں طرف لوگ بہت خوش تھے۔ اور ہماری خوشی دیکھ کر مسٹر چلتا پُرزہ کی باچھیں کھلی جاتی تھیں

اس روز ہم لوگ صبح سویرے اُٹھ کر سامان ٹرک میں لاد کر کولابے روانہ ہوئے اور کولابے والا جوڑا دارسوا کی سمت چلا۔ بیچ میں جانے کیا گڑبڑ ہوئی۔ اس کا حال بہت لمبا ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔ کہ شام ہوتے ہوتے ہم کولابے میں تھے۔ اور وہ لوگ وارسوا پہنچ گئے۔ لیکن گھر دونوں میں سے کسی کو نہ مل سکا۔ نہ میرا ان کو اور نہ ان کا مجھ کو۔ جانے کیسی قانونی پیچیدگی بیچ میں آئی کہ آج تک وہ دونوں گھر مسٹر چلتا پُرزہ کے پاس ہیں۔ اور وہ انگریز جوڑا دارسوا کے ایک ہوٹل میں رہتا

ہے اور میں کولابے کی سڑک پر رہتا ہوں کہ درویش بھی کیا رہتے ہوں گے۔

تو بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مکان کی قلت، نئے مکان بنانے سے دور کی جا سکتی ہے۔ مکانوں کی ہیرا پھیری سے اس قلت کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شرافت نہیں۔ "چلتا پُرزائیت ہے"۔ شرافت محنت چاہتی ہے۔ اور چلتا پرزئیت خالی ہیرا پھیری سے کام لیتی ہے۔ نتیجہ وہی درویشی اور قلندری۔ فقر و فاقہ! آپ پوچھیں گے اس فقر و فاقہ کو بھی دور کرنے کا کوئی طریقہ ہے۔ یہ "چلتا پُرزائیت" کیسے دور کی جا سکتی ہے۔؟ اس کا حل اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ زندگی میں دو طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ ایک تو وہ جو چلتے پُرزے ہیں۔ دوسرے وہ جو بیٹھے ہوئے پُرزے ہیں۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کہ اگر بھی لوگ چلتے پُرزے ہو جائیں تو اس کا حل نکل سکتا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ بھی پُرزے بیٹھ جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں طریقے غلط ہیں، کیوں کہ، اور یہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اکثر بہت سے چلتے پُرزے آخر میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور چلنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف بہت سے بیٹھے ہوئے پُرزے یکا یک اُٹھ کر چلنے لگتے ہیں۔ یعنی چلتے ہوئے پُرزے بھی بیٹھے ہوئے پُرزوں سے نکلتے ہیں۔ اور ہر آدمی اپنے اندر چلتا پرزہ کا رجحان بھی رکھتا ہے۔ یعنی ہر آدمی کبھی نہ کبھی کوئی ایسی بات کر جاتا ہے، جسے یار لوگ "ہاتھ کی صفائی" کہتے ہیں۔

اس لیے یہ لڑائی دونوں طرف لڑی جائے گی۔ یعنی اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ باہر کے چلتے پُرزے کا بھی مقابلہ کرو۔ اور اندر والے کا بھی۔ یعنی خود بھی محنت کرو اور دوسروں سے بھی محنت کراؤ اور کسی ایک محنت کا پھل دوسرے کو نہ کھانے دو۔ جب یوں ہوگا تو زندگی میں نہ کوئی چلتا پُرزہ ہوگا نہ کوئی ڈھیلا پُرزہ۔ بلکہ سب کام کے پُرزے ہوں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر زندگی سے چلتا پرزائیت خود بخود ختم ہو جائے گی اور ان اور اس کا سماج اور اس کی زندگی روشن اور صاف اور شفاف سورج کے ساتھ رواں دواں ہوگی۔

غلط فہمی

جن لوگوں کے متعلق عوام غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی ہوں۔ کہنے کو تو میں ایک گھٹیا سے کالج میں رذیل قسم کا پروفیسر ہوں پچھتر روپے تنخواہ ملتی ہے اور سارا دن ایف اے کے لڑکوں کی املا درست کرنے میں گزرتا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ میرے گاؤں کے لوگ میرے معمولی واقف کار اور چند وہ پرانے احباب جو کبھی ایف۔ اے پاس۔ اے میں ہم جماعت تھے اب کسی دور افتادہ شہر میں کسی پرائیویٹ فرم میں کلرکی کی آسامی پر سڑ رہے ہیں۔ مجھے کسی فلم کے ہیرو سے کم نہیں سمجھتے۔ اگر گاؤں والوں میں سے کسی کی پیشی لاہور کی کسی کچہری میں پڑ جائے تو وہ کم بخت وہیں گاؤں والوں میں سے میرا لاہور کا پتہ پوچھ آتا ہے۔ پھر نہایت فخر سے تانگے والے کو کہتا ہے چل نمبر ۴۴ چنگڑ محلے پروفیسر صاحب کی کوٹھی جانا ہے۔ گویا سارے لاہور میں ایک میں ہی پروفیسر رہ گیا ہوں۔ اور وہ جو گنجے سروں والے پانچ سو روپے پاتے ہیں محض جھک مارتے ہیں اور نرے چور ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کم از کم میری آدھی تنخواہ انہی بن بلائے مہمانوں کی خاطر تواضع میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جس کا صلہ مجھے صرف اتنا ملتا ہے کہ واپس گاؤں جا کر میرے متعلق شیخیاں بگھاری جاتی ہیں۔ میں وہاں لاہور پیشی تھی۔ گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے گھر پر ٹھیرا تھا۔ انہوں نے میری بہت خاطر کی۔ دو دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملنے نہ دیا۔ بہت سعادت مند ہے۔ غرور نام کو نہیں چھو گیا۔

گو میری تنخواہ صرف پچھتر روپے ہے۔ مگر سوائے چند ایک دیرینہ احباب کے ہر شخص کو میری تنخواہ کے متعلق بھی غلط فہمی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا نہ کرے کم از کم ڈھائی سو تنخواہ پاتا ہوں اس کا تذکرہ نہایت حاسدانہ لہجہ میں کیا جاتا ہے۔ جسے سننے میں گو مجھے کوفت بھی ہوتی ہے۔ تو ایک قسم کی مسرت بھی۔ مثال کے طور پر بازار میں چلتے چلتے کوئی پرانے ہم جماعت مل گئے۔ اچھی طرح سے مصافحہ ہوا اس کے بعد "یار سُنا ہے، کہ تم پروفیسر ہو گئے ہو (سُنا ہے؟ گویا یقین نہیں آتا) یار سُن کر بہت مسرت ہوئی (پروفیسر میں بنا اور مسرت ان کو ہوئی) یار خوب عیش کرتے ہو نا (یعنی خدا تمہیں غارت کرے) اور ڈھائی سو روپے تنخواہ پاتے ہو۔ ذرا میری طرف دیکھو لدھیانہ میں کھرز برڈ کمپنی پینتیس روپے تنخواہ لیتا ہوں۔ ایک بیوی ہے اور دو بچے۔ جان ضیق میں ہے تم تو عیش کرتے ہو یار" دو ڈھائی سو روپے تنخواہ" غرضیکہ احباب دو ڈھائی سو روپیوں، کا ذکر اس دلی خلوص اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ اکثر مجھے بھی اطمینان سا ہو جاتا ہے۔ اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ واقعی میری تنخواہ اتنی ہی ہے۔ مگر جب مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔ تو یہ دلفریب سراب پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے میری علمی قابلیت کے متعلق مختلف نظریئے قایم کر رکھے ہیں۔ اور میری ہزار کوششوں پر بھی وہ ان نظریوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ گاؤں والے خصوصاً تو سمجھ چکے ہیں۔ کہ دُنیا بھر کے علوم و فنون جانتا ہوں۔ اگر کسی کو اپریشن کرانا ہو۔ اگر کسی کا مقدمہ ہو۔ کسی کو دمے کی بیماری ہو کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو وہ فوراً لاہور آکر مجھ سے صلاح طلب کرتا ہے۔ اور مجھے چارو ناچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے اول تو سچ سننے کو کوئی تیار نہیں۔ اور پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر لوگ آپ پر خواہ مخواہ ایمان لے آئیں تو موسیٰ بننے میں کون سی دقت رہ جاتی ہے۔ اور پھر میں تو کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ عدم تشدد کے فلسفے، بورڈنگ کی روٹیوں اور غلط املا سے بھری ہوئی

کاپیوں نے مجھے بے حد بزدل بنا دیا ہے۔

بعض افراد کے نزدیک میرا پروفیسر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ میں لاہور کے سب بڑے بڑے حاکموں، نوابوں، اور یونیورسٹی کے ممتحنوں کو جانتا ہوں۔ کوئی چاہتا ہے کہ میں ڈپٹی کمشنر سے اس کی ملاقات کرا دوں۔ کوئی کسی بیمہ کمپنی میں نوکری کا متلاشی ہے۔ کوئی نواب جھنگڑخاں کی کوٹھی کو تعمیر کرنے کا ٹھیکہ مانگتا ہے۔ اور مجھے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا ہر ایک سے ہاں کر دیتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تو بلا ٹل جاتی ہے۔ بعد میں بہت باتیں گھڑنا پڑتی ہیں۔ مگر بعد میں۔ یہی غنیمت ہے۔ ابھی اس دن کا واقعہ ہے میرے دوست شیر علی خاں بلوچ تشریف لے آئے۔ شاید تیسری جماعت میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ اب اتنے سالوں بعد آج ملاقات ہوئی کہنے لگے۔ "آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں شیر علی خاں بلوچ ہوں میں آپ کے ساتھ تیسری جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ یاد آیا۔؟"

خود یاد آیا۔ یہ وہی صاحب تھے جو اکثر میرے پیسے چھین لیا کرتے تھے۔ جیب سے ریوڑیاں نکال کر کھا جایا کرتے تھے۔

اوہو۔ "آپ ہی شیر علی خاں ہیں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کہیئے مزاج کیسے ہیں۔ سوڈا ووڈا منگواؤں۔؟"

سوڈا وغیرہ تو بعد میں پی لوں گا۔ شیر علی خاں نے کہا۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ یہاں پروفیسری کرتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ میں آج کل میں نارمل کا امتحان دے رہا ہوں جغرافیہ کا پرچہ بہت بُرا ہوا ہے۔ پاس ہونے کی مطلق امید نہیں میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کے پاس چلوں۔ آپ خان بہادر رچ کو تو جانتے ہوں گے۔ اگر مل ملا کے کام ہو جائے۔

میں نے دل میں سوچا کہاں خان بہادر رچ۔ اور کہاں میں نہ ہی تو میں ان کو جانتا ہوں۔ اور نہ ہی ملنے ملانے سے یہ کام ہو سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ میں ذرا بزدل واقع ہوا ہوں اس لیے میں نے جھٹ کہہ دیا۔ "یہ تو معمولی سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات ہے خان بہادر سچ ـــــ کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں ۔ ابھی کل ہی تو میرے ہاں چائے پینے آئے تھے ۔ اگر آپ اس وقت آجاتے خیر کوئی بات نہیں ۔"

خدایا تیرا ہزار ہزار شکر ۔ شیر علی بلوچ نے گرج کر کہا ۔ آپ پھر ان کو ملیں گے نا ۔ میرا رول نمبر لکھ لیجیے ۔ نمبر ۳۶ ہے ۔ بھول لیے گا نہیں ۔"

کبھی ہو سکتا ہے ۔ میں نے کہا ۔ ۳۶ نمبر مجھے اچھی طرح لکھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں کل ہی خان بہادر کو کہہ دوں گا ۔

اچھا تو میں چلتا ہوں ۔

واہ صاحب آئے بھی اور چل بھی دیئے ۔ ایک دو دن تو ٹھہریئے ۔ ضرور ٹھہرتا ، ضرور ٹھہرتا ۔ شیر علی خاں نے اُٹھتے ہوئے کہا ۔ مگر کل دوسرا پرچہ ہے پھر کبھی حاضر ہوں گا

شیر خاں چلے گئے ۔ اور بات آئی گئی ہو گئی ۔ کم از کم میرے ذہن سے تو یہ واقعہ بالکل اُتر گیا ۔ لیکن ایک روز کیا ہوا ۔ کہ عین رات کے گیارہ بجے کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھولا ۔ دیکھا شیر علی خاں تھا ۔ "آیئے آیئے" میں نے بناوٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ۔

شیر علی خاں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا ۔ میں اسی بات کے لیے حاضر ہوا ہوں ۔ کہیئے کچھ بنا ۔ ؟"

سب کام ٹھیک ہو گیا ۔ آپ تسلی رکھیں میں نے اسی دم جھوٹ موٹ کہا ۔

"کیا انھوں نے مجھے پاس کر دیا ۔"

ہاں ہاں میں خان بہادر کے پاس گیا تھا ۔ وہ کہنے لگے ۔ آؤ یار مدت کے بعد آئے ہو میں نے کہا ایک لڑکے کو پاس کر دیجیے چنانچہ انھوں نے بیس نمبر اور دے دیئے ۔ اندر تشریف لایئے نا ۔ میں نے شیر علی خاں سے کہا ۔

میں آپ کا کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں ۔ شیر علی خاں نے کہا ۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھول سکتا ۔

کس کا احسان دوست ! میں نے انکساری ظاہر کرتے ہوئے کہا میں تو آپ کا خادم ہوں یہ تو ایک بالکل معمولی بات ہے ۔

ہاں تو مگر آپ کو ٹھیک پتہ ہے نا ۔ شیر علی خاں نے کہا ۔ بیس نمبر دیئے تھے ۔ ہاں ہاں پورے بیس ۔

میرا رول نمبر تو آپ کو یاد تھا ؟ بھلا کیا یاد تھا ۔ ؟ شیر علی خاں نے کہا ۔

یہی نمبر ـــــ نمبر (کمبخت یاد نہیں آتا ۔) یہی نمبر ۳۷ تھا ۔

نمبر ۳۷ شیر علی خاں بلوچ نے چیخ کر کہا ۔ میرا نمبر تو ۳۶ تھا ۔

ہاں نمبر ۳۶ ۔ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ۔ اُف کتنی غلطی ہوئی میں نے ۳۶ کو ۳۷ سمجھ لیا ۔

شیر علی خاں بولے ۔ میں نے آپ کو اسی وقت کہا تھا کہ آپ میرا رول نمبر لکھ لیں مگر آپ نے نہ لکھا ۔ نمبر ۳۷ والا تو پہلے ہی بہت لائق لڑکا ہے ۔

اوہو ٹھیک یاد آیا میں نے جلدی سے جواب دیا ۔ کتنی بھول ہوئی ۔ تبھی تو خان بہادر کہتے تھے اس لڑکے کو پہلے ہی بہت نمبر ملے ہیں ۔ تم اسے بیس نمبر اور کس لیے دینا چاہتے ہو ۔ کیا اسے یونیورسٹی میں اوّل کرانا چاہتے ۔ تو میں نے کہا تھا ۔ خان بہادر صاحب آپ اسے میری خاطر بیس نمبر اور دے دیجیے اُف اب خیال آتا ہے ۔ نمبر ۳۷ تھا کتنی غلطی ہوئی ۔

پھر ۔ ؟ شیر علی خاں نے پوچھا ۔

آپ مطلق فکر نہ کریں میں نے اسے تسلی دے کر کہا ۔ کل ہی خان بہادر کے ہاں جا کر انھیں حقیقت سے واضح کر دوں گا ۔ اور اس لڑکے کے بیس نمبر کاٹ کر آپ کو دے دیئے جائیں گے ۔"

شیر علی خاں چلا گیا ۔ اور میں پھر اس واقعہ کو بھول گیا ۔ ایک مہینے کے بعد اچانک مجھے شیر علی خاں کا خط آیا وہ پاس ہو گیا تھا ۔ اور اس نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیر علی خاں کے اس واقعہ کے بعد لوگوں کو پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ یونیورسٹی میری زرخرید غلام ہے۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماموں مجھ سے ملنے کے لیے آئے باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ امسال عزیز پرکاش چند نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ انگریزی اور حساب کے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ یوں تو جماعت میں خاصا لائق سمجھا جاتا ہے لیکن ڈر ہے کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اس کا ذرا خیال رکھنا اور ممتحنوں سے مل کر ——

میں نے سر ہلا کر کہا۔ اوہ۔ بالکل فکر نہ کریں۔ پرکاش ضرور پاس ہو جائے گا۔

اس کے بعد ماموں جان کے کئی خط آئے۔ اور ہر خط میں یہ فقرہ ہوتا تھا۔ "میں نے وہ بات جو آپ کو لاہور میں کہی تھی دھیان رکھنا۔" اور کبھی کبھی مامی جان بھی لکھ بھیجتی تھیں۔ "پرکاش کا خیال رکھنا پرکاش گویا تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر تم نے اس کو پاس نہ کرایا تو میں ساری عمر تم سے نہ بولوں گی۔" وغیرہ وغیرہ۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پرکاش چند پاس ہو گیا۔ بس اب میرے ماموں سب کو سناتے پھرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے پاس کرایا ہے۔ آخر اپنے عزیز کو اتنا بھی فائدہ نہ ہو تو اور کیا ہو گا۔ اور ادھر پرکاش چندر ایف اے میں داخل ہونے کے لیے آیا۔ تو میں نے تہدید کے انداز میں اس سے پوچھا کیوں بے پرکاش یہ تو ہسٹری کے پرچے میں کیا اوٹ پٹانگ لکھ آیا تھا۔ اکبر کی جگہ اشوک اور وارن ہیسٹنگز کی جگہ لارڈ ڈلہوزی کا عہد حکومت کیوں لکھ دیا۔ پھر انگریزی کے پرچے میں تو لیجیے اتنے غلط کیوں تھے عزیز کام کرنا سیکھو ورنہ ہر سال تو میں پاس کرانے سے رہا۔

اور بیچارے پرکاش چندر نے سر جھکا کر کہا۔ جی غلطیاں کیا بتاؤں ہو ہی گئیں۔ مگر لڑکے ہر سال پاس نہیں ہوتے۔ تو میرے پاس اس کے لیے بھی گھڑے گھڑائے جواب موجود ہیں۔

اجی آپ کا لڑکا کیا پاس ہوتا۔ آپ نے تو اُلٹا مجھی کو شرمندہ کرایا۔ میں لالہ

ایشری پرشاد کے پاس گیا۔ تو انھوں نے سب پرچے میرے ہاتھ میں دیدیئے اور کہا تم ہی انصاف سے جتنے نمبر چاہو دے دو۔ اب میں کیا کرتا کچھ لکھا ہوتا تو نمبر دیتا۔ جو جواب دیکھو غلط۔ املا غلط، ہجے، معانی غلط، کچھ میں نہیں آتا یہ لونڈا سارا سال کیا کرتا رہا ہے۔

کرتا کیا رہا ہے۔؟ لڑکے کا باپ چھڑی ہاتھ میں لے کر جواب دیتا ہے بدمعاش کہیں کا۔ سارا سال تاش کھیلتا رہا ہے۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ یہ پاس کیسے ہوتا۔ کیوں بے حرامی۔

اب اس طرح سے کئی لڑکوں کو نپوا چکا ہوں پھر بھی لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

میں نے تنگ آ کر پروفیسری چھوڑ دی ہے۔ اب میں انار کلی میں آٹے، تیل، نون کی دوکان کرتا ہوں۔ مگر اس پر بھی لوگوں کی غلط فہمی دور نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی تک پروفیسر ہوں اور اس دوکان پر یونہی چلا آتا ہوں۔ یا شاید یہ میرے کسی دوست کی دوکان ہے۔ اگر میں کسی کو سچی بات بتا بھی دوں تو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اس لیے خوب کھکھلا کر ہنستے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہا! ہا! پروفیسر صاحب آپ تو نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔

اس دُنیا میں سچائی جھوٹ ہے۔ اور جھوٹ سچائی۔

※

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گانا

گانا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم تو وہ ہے جو متوسط درجے کے گھروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اور یہاں بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو سُنی بھی جاتی ہے عام طور پر ایک گھٹیا سا رذیل ہارمونیم ہوتا ہے۔ یوں تو موسیقی کے اعتبار سے ہر ہارمونیم ہی فطرتاً رذیل ہوتا ہے۔ لیکن پھر اس رذالت کے بھی کئی درجے ہیں۔ اور متوسط گھروں میں اکثر باجے درجہ سوم اور چہارم کے ہوتے ہیں۔ مگر خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی، اصل چیز تو "گانا" ہے۔ گانے کے لیے متوسط درجے کے گھر میں ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے۔ بہت سے گھروں میں شاید ایک سے زیادہ ہوتی ہوں گی۔ لیکن اوسط کے اعتبار سے ایک ہی کافی ہے۔ آپ اس لڑکی کو جو چاہے کہہ کر پکاریئے۔ بملا، کملا، زبیدہ، پرکاش کور مطلب ایک ہی ہے یعنی اوسط گھرانے کی لڑکی جو گانا جانتی ہے۔ اور جس پر سارے "گھر والوں" کو ناز ہے۔ اب اس لڑکی کو آپ ذہن میں رکھیے اور پھر اس ہارمونیم کی طرف بھی خیال کیجیے جو اس طاقچے میں لکڑی کے صندوق میں جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا ہے نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔

متوسط درجے کے گھروں میں گانا عموماً کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا محرک بیچارہ وہ غریب مہمان ہوتا ہے۔ جو بھولا بھٹکا کبھی متوسط درجے کے

گھر میں آنکلتا ہے۔ پیٹ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اور چند لمبی لمبی کھٹی ڈکاریں لے کر میزبان سے پوچھتا ہے۔

"تاش واش کھیلو گے۔؟"

"نہیں۔"

"ایک آدھ بازی برج کی۔؟"

مہمان ایک جمائی لے کر جواب دیتا ہے۔ "جب سے سکرٹریٹ میں ملازم ہوا ہوں برج بھی بھلا بیٹھا ہوں۔"

"اچھا تو پھر —— جا مُنّے گراموفون اٹھا لا۔"

جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت و مشقت میں نہیں۔ نہ اس امر میں کہ انھوں نے مغربی تہذیب و سائنس کو اپنایا ہے بلکہ محض اس امر میں کہ وہ لوگ ہندوستان کے متوسط طبقے کو جاپانی گراموفون، جاپانی کریب، جاپانی سائیکل، جاپانی گھڑیاں جاپانی تصویریں اور اسی قسم کی ہزاروں سستی اور بیکار چیزیں بھیج کر اسے ہمیشہ فریب نفس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ سیاسی غلامی اور ذہنی غلامی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر اس گراموفون کو لیجیے، دیکھنے میں سب خوشنما بالکل ریڈیو معلوم ہوتا ہے۔ قیمت صرف پچیس روپے دسویں بارہویں دن اس کا فنر ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر یہ بالکل فروعی اصل بات تو یہ ہے کہ گانا! ناچ آپ نے سُنا۔ پتلی کر توری بل کھائے جائے —— "جی میں نے فلم دیکھا تھا۔"

"اوہ —— اچھا یہ ریکارڈ! اک سرے ماہی دی مندری۔ بابو! یہ آپ نے سُنا ہوگا۔"

"اچھا سُنا دیجیے۔"

ریکارڈ بجنا شروع ہوتا ہے۔ آدھا ریکارڈ ختم ہونے کے بعد فنر ٹوٹ جاتا ہے۔ یا یوں ہی گھڑگھڑاہٹ کی آوازیں سُنائی دینے لگ جاتی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میزبان بُرا مُنہ بنا کر کہتا ہے۔ "ارے مُنّے ــــــ گراموفون بند کر دو اور پھر مُسکرا کر، بملا' (یا کملا) زبیدہ، پرکاش کور) انھیں گانا سُناؤ بیٹی!

بملا آخر متوسط گھرانے کی لڑکی ہے۔ حیا سے کانوں تک سُرخ سُرخ ہو جاتی ہے۔ اور سر جُھکا لیتی ہے۔ اس طرح کہ بے چارے مہمان کو پورا یقین ہو جائے کہ بے چاری بملا گانا تو کجا بولنا بھی نہیں جانتی۔

میزبان دوسری بار پھر پیار سے مگر اونچی آواز میں کہتا ہے۔ بملا! جا ہارمونیم لے آنا، وہ اس طاقچے میں دھرا ہے۔

اور مہمان جس کی پلکیں نیند سے جُھکی جا رہی تھیں آہستہ سے ہمت بڑھانے کو کہہ دیتا ہے۔ ہاں بہن بملا! کچھ سُنا دو۔ سُنا ہے تم بہت اچھا گاتی ہو (اور پھر جلدی سے یہ فقرہ جڑ دیتا ہے رام بھروسے کی ماں۔ سُنا تھا۔

اب یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ نہ بے چاری بملا اچھی طرح گا سکتی ہے اور نہ رام بھروسے کی ماں گانا سُن سکتی ہے۔ کیوں کہ وہ بے چاری تو بہری ہے۔ اور پھر "بہن کملا!" اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ہندوستان ہے جہاں عورتوں کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک قسم ماں، دوسری قسم بہن، اگر خوب صورت ہو جوان ہو تو بہن اور اگر بدصورت، ادھیڑ، بوڑھی ہو تو ماں۔ بس اور تیسری قسم اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ جب عورت کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر وہ عورت نہیں رہتی بلکہ پاؤں کی جوتی بن جاتی ہے۔

اب بملا گاتی ہے، باپ حقّہ پی رہا ہے، اماں مونڈھے پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں لیے لڑکی طرف دیکھ رہی ہے کہ کہیں بملا نگاہ اُٹھا کر مہمان کی طرف تو نہیں دیکھ رہی ...... باریک مدھم آواز میں بملا گا رہی ہے، ہارمونیم الگ اپنے سروں کو بجا رہا ہے۔

گلا ...... ہاں گلا ...... کاٹ لو ...... گلبدن دھیرے دھیرے دھیرے دھیرے ......

مہمان گانا سُنتے سُنتے تصویر کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ قصاب تیز چُھری گردن پر رکھے بیٹھا ہے اور نیچے بکری ممیا ممیا کر کہتی ہے۔ "گلا ...... ہاں گلا ...... کاٹ لو گلبدن" کی تشبیہ کتنی نازک اور پیاری ہے۔ یہ شاعر لوگ بھی عجب دماغ رکھتے ہیں، مہمان ابھی یہاں تک ہی سوچ سکتا ہے کہ بملا دوسرا گانا شروع کر دیتی ہے اب اک نئی لے ہے، مدھم اور غمگین۔

تم میرے ...... تم میرے ...... میں تیری

اوں ...... اوں ...... اوں

تم میرے ...... تم میرے .... میں تیری

اوں ...... اوں ...... اوں

اور بیچارہ مہمان حیران ہو کر سوچتا ہے کہ اس اُوں اوں کا کیا مطلب، مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا، آخر جرأت کر کے پُوچھ لیتا ہے اور بہن بملا لجا کر کہتی ہے، جی میں نے فلم میں ایسے ہی سُنا تھا۔

متوسط طبقے سے اوپر گانا اپنی ہیئت یکسر بدل لیتا ہے اس کی تمام جزئیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور ہارمونیم کی جگہ گیند کی طرح گونجتا ہوا آرگن "یہ میں نے بارہ سو روپے میں خریدا تھا۔ کچھ اتنا بُرا بھی تو نہیں" شرمیلی بملا کی جگہ ایک شوخ و شنگ تتلی رنگین ہونٹ، بیباک نگاہیں، آپ کیا سُننا پسند کریں گے۔؟ بلو ڈینیوب! یا گریس مور کا نغمہ، اچھا۔؟ آپ مغربی موسیقی کو پسند نہیں کرتے ــ .... مگر ہنگل تو کب کا پُرانا ہو چکا ...... آرگن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے ...... اُس دن آپا کماری جو تھیکارائے کا ایک ریکارڈ لے آئیں یوں ہی پسند آ گیا جیسے ریڈیو پر بھی کبھی کبھی کوئی چیز اچھی آ ہی جاتی ہے انگلیاں پھیرتے پھیرتے گانا شروع کر دیتی ہے۔ اور گانے کے دوران میں بار بار دیکھتی جاتی ہیں، آپ کی طرف، اور آپ مُسکرا مُسکرا کر داد دیتے ہیں۔ اور گانا ختم ہونے پر تالی بجاتے ہیں۔ "آپ کس سے گانا سیکھتی ہیں۔!" "مسبتے غازی لکھنوی سے" "وہ تو بڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُستاد ہیں اپنے فن کے؟" ہاں اڑھائی سو سے کم نہیں لیتے، پاپا کہتے ہیں گانا سیکھنا ہو تو کسی لکھنوی استاد سے سیکھا ناچ بھی وہی سکھاتے ہیں۔!"

دراصل متوسط درجے سے اوپر گانا کم اور ناچنا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اور پھر گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، اور اس کا نام ہے "کلاسیکی میوزک" عجیب شے ہوتی ہے یہ بھی، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا ہے شاید اسی لیے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خاص کر وہ گروہ جو اپنے آپ کو ادب اور آرٹ کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔ کلاسیکل میوزک کے سوا اور کسی شے کو پسند نہیں کرتا۔ کوئی چیز "سنائیے یہ چیز" دوسرا نام ہے کلاسیکل میوزک کا، "چیز" میں آکر گانا اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوئی "چیز" سُننے پر اس قدر مصر رہتا ہے۔ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کلاسیکل میوزک کا ماہر ثابت کرے "اس دن ہم نے وائی ایم، سی، اے میں جی، دشوار اور جاگنی کا گانا سُنا، کیا دھر پد گایا ہے۔ بھاگ اور سورٹھ، جی، مالکونس اور تلنگ، واہ واہ، یا پھر اس دن لطف آیا تھا۔ جب ہم نے پیارو قوال کو نواب ماجب کو دعوت دینے کے موقع پر اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ واہ واہ، چھجے نے کیا کیا تانیں اڑائی تھیں۔ کیا کیا کلیاں بنائی تھیں۔ بھیم اور جوگ بھیرویں، اور درباری اور مانڈو...... بس مانڈو تو پیارو قوال پر ختم ہے۔!"

میرا اپنا تجربہ ہے کہ کلاسیکل میوزک کا ماہر بننے کے لیے کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آتی، آٹھ دس راگ راگنیوں کے نام چیز، کلی، تان، پھیرن، پلٹا اور اس قسم کے آٹھ دس فنی نام یاد کر لیے جائیں۔ طبلے کی تھاپ پر کبھی کبھی سر ہلا دیا جائے۔ لوگ کہیں دیکھیے ہنسے صاحب بھیم کی گت کیا خوب بجاتے ہیں۔ آپ کہیں نہیں صاحب ہم تو طبلے کی تھاپ پر مر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مجلس میں آپ کو کلاسیکل میوزک کا استاد سمجھنے لگ جائیں گے ہر ایک گویا آپ کی

طرف ہی بازو بلا بلا کر گائے گا۔ تانی، دھانی، پاما گا دھا، تانی دھا! اور آپ سر ہلا کر کہیں گے۔ بھئی، واہ، واہ واہ چیز کس خوبی سے اٹھائی ہے۔ بس اب "اُڑ کلیان" سُنا دو تو روح خوش ہو جائے۔

سیانوں سے سُنا تھا کہ گانا روح کی غذا ہے، لیکن ان تین قسموں میں کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو روح کو بالیدگی بخش سکے، یہ سب نام و نمود کے دھندے ہیں، ان تینوں طبقوں کے لوگ گانا سُنتے ہیں، تاکہ موجودہ تہذیب کے ظاہری لوازم کو پورا کر سکیں اس کے پس پردہ ڈر ہر وقت موجود رہتا ہے، مبادا کوئی انھیں جاہل، ادب اور آرٹ سے بے گانہ سمجھ لے، اسی لیے تو موٹی توند والا رئیس اور بڑی مونچھوں والا نواب اور باتیں بنانے والا پروفیسر اور سکرٹریٹ کی میز پر سر جھکا کر لکھنے والا کلرک ہر ایک اپنے آپ کو گانے کا شیدائی جتاتا ہے۔ —— لیکن گانے کی ایک اور بھی قسم ہے، چوتھی، آخری اور سب سے نچلی، یہاں نہ ہارمونیم ہوتا ہے، نہ ستار نہ وائلن نہ آرگن، یہاں نہ کلیاں بنائی جاتی ہیں، نہ پلٹے اٹھائے جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی ڈھولک ہوتی ہے۔ اور پچاس ساٹھ مزدور اور ان کی عورتیں اور لڑکے لڑکیاں، اور ننگ دھڑنگ بچے۔ تالیاں بجاتے پاؤں ہلاتے۔ "بجریا توری پہ بل ہار، بجریا توری" ملی جلی آوازیں، موٹی، پتلی، لمبی، کوئی گاتے گاتے کھانسنے لگ جاتا ہے۔ کوئی گاتے گاتے ہنسنے لگ جاتا ہے، درمیان میں ڈھولک بجتی ہے۔ کوئی پاؤں میں گھونگھرو باندھ کر جھنجھنا رہا ہے تو کوئی کانسی کے کٹورے میں پیسے رکھ کر بجا رہا ہے۔ کھلا سا گندہ صحن ہے۔ آسمان پر ستارے ان گھونگھروؤں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں جو کسی مست رقاصہ کے ٹخنوں سے اُتر کر اِدھر اُدھر فرش پر بکھر گئے ہوں، ان کے درمیان میں چاند ہے اور جو کانسی کے کٹورے کی طرح چمک رہا ہے، گاتے ہوئے مزدور، چمکتا ہوا چاند، بے ہنگم لیکن پر مسرت نغمہ دل کو خوش کرنے والا، دن بھر کی تھکن اتار دینے والا، سیانوں نے

سچ کہا تھا۔ گانا روح کی غذا ہے ــــ لیکن کئی لوگوں کے پاس روح نہیں ہوتی۔ وہ صرف ایک خول رکھتے ہیں۔

٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان پہچان

اجنبیوں اور دشمنوں کو چھوڑ کر آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں دوست، یعنی محض دوست، اوّل اور آخر دوست، بے تکلف بے شرم، بے حیا، ایسے آدمیوں سے جی ہمیشہ خوش رہتا ہے کیوں کہ آخر ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں اور پھر ساری عمر ان کے ساتھ ہی نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اپنے دوستوں میں بھی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔

دوسری قسم کے آدمی وہ ہوتے ہیں، جنھیں انگریزی میں ایکوڈینٹس اور اردو کی عام اصطلاح میں "جان پہچان" کے لوگ کہا جاتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ان جان پہچان کے لوگوں سے انتہائی نفرت ہے بقول یسوع مسیح اپنے دشمن سے محبت کر سکتا ہوں، مگر جان پہچان کے لوگوں سے خوش کلامی سے پیش آنا میرے لیے ایک نہایت دشوار امر ہو گیا ہے گو یہ لوگ آپ کو کبھی کبھار ملتے ہیں۔ مگر جب ملتے ہیں تو اتنا زچ کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ پر زور سے ایک چانٹا رسید کرکے کہا جائے "آداب عرض بندہ اب چلتا ہے، امید ہے پھر ملاقات ہوگی۔ کچھ تھوڑی سی بدتہذیبی تو ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ بدتہذیبی دوستوں میں جائز ہے تو جان پہچان کے لوگوں میں کیوں نہ روا رکھی جائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مثال کے طور پر اس روز کے واقعے کو لیجیے۔ میں انار کلی میں ایک دُوکان کے باہر کُرسی پر بیٹھا کباب کھا رہا تھا کہ جس طرح شریف ہندوستانیوں کا پُرانا دستور ہے۔ اور کبھی کبھی بازار میں تیز تیز موٹروں کے گزر جانے سے حلق میں تھوڑی سی اڑتی ہوئی مٹی بھی پہنچ جاتی تھی۔ مگر اس کا کیا ہے اگر ہم اپنی پُرانی وضعداری نہ نبھائیں گے تو اور کون نبھائے گا۔ انگریزوں کو دیکھیے کیا انھوں نے کبھی گرمیوں میں ہماری ڈھیلی ڈھالی شلوار، اور دھوتیاں اور لمبے لمبے پتلے پتلے ململ کے کرتے پہنے ہیں۔؟ اگر نہیں تو ہم کیوں بازار میں بیٹھ کر کباب اور چاٹ نہیں نہ کھائیں؟ کیوں۔؟

معاف کرنا مجھے کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گیا۔ اور دراصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت میں غصہ بہت ہے۔ کچھ تو کباب سرد تھے پھر بازار میں "اڑتی ہوئی گرد" اور میں ابھی پوری طرح اپنی قسمت پر غور و خوض بھی نہ کرنے پایا تھا کہ مسٹر روی دت دھمکے، وہ سامنے سے دانت نکالے چلے آ رہے تھے اور میں کباب کھا رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو بھاگ نہ سکا اور انھوں نے آکر مجھے شانوں سے پکڑ لیا۔ اور مجھے اچھی طرح جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

"ہیلو! ہیلو۔"

اس کے بعد آپ ہی ہنسنے لگے ہی، ہی، ہی۔

اب بھلا یہ ہنسی کس بات پر تھی۔ میں نے کہا اچھے تو ہیں آپ یعنی میرا مطلب یہ تھا۔ "خدا اگر تمھیں غارت کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ ان جان پہچان کے لوگوں کی ایک بہت بڑی "نفسیاتی" خصوصیت یہ ہے کہ جب ملتے ہیں تو نہایت تپاک سے اور اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ تم اگر ان کے سگے بھائی نہیں ہو تو چچازاد بھائی سے کیا کم ہو گے اتنی خوشی، اتنی دلی مسرت اتنی الفت کا اظہار کرتے ہیں کہ تمھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اگر یہ کمبخت آج مر گیا تو کم از کم آدھی جائیداد ضرور ہمارے نام لکھ جائے گا۔

چنانچہ میں نے روی دت کو کہا۔ "کباب کھائیے۔"

"نو ــــ نو ــــ تھینک یو ــــ تھینک یو ــــ"

یہ کہہ کر آپ ساتھ والی کُرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئے اور کباب اڑانے شروع کر دیئے۔ کباب کھاتے کھاتے بکنے لگے۔ یار تمھیں مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے کتنی مسرت، ارے یار کیا بتاؤں کتنی مدت کے بعد ملے ہو، میاں تین کباب اور دینا "گرما گرم" ہوں۔

یار؟ مجھے اپنے دل میں انتہائی ندامت محسوس ہوئی۔ یہ بیوقوف کا بچہ پروفیسروں کا لونڈی مجھے اپنا دوست کہتا ہے۔ اور حالاں کہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بی۔ اے میں میرا ہم جماعت تھا اور بس۔ نہ سلام نہ دُعا۔ میں صرف اس کی شکل ہی سے اسے پہچانتا تھا۔ ورنہ بی۔ اے میں تو میں نے کبھی ان تپ دق کے مریضوں سے واسطہ نہیں رکھا۔ کاش نہ میں سڑک پر بیٹھ کر کباب کھاتا نہ اس حالت کو پہنچتا۔

"دو کباب اور دینا ــــ" روی دت نے کہا، یار کیا بتاؤں تمھیں مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ بھلا کے سال ہو گئے ہیں تمھیں ملے ہوئے، تین کہ چار، میں نے دل میں کہا اے خدا! یا تو بی۔ اے میں اس کی شکل تو نے دکھائی تھی یا آج پھر یہ منحوس صورت میرے سامنے لایا ہے۔ تیرے بھید کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے روی دت سے مسکرا کر کہا۔ "غالباً چار سال" بی۔ اے پاس کرنے کے بعد۔"

"ہاں ٹھیک یاد آیا، چار، پورے چار۔" روی دت نے جواب دیا۔ "چار، چار کباب دینا ذرا گرم ہوں۔"

یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے، ورنہ زکام اور جان پہچان کے لوگ یہی تو وہ بیماریاں ہیں جن کا حکمی علاج آج تک کسی ڈاکٹر یا حکیم نے معلوم نہیں کیا۔ اس موقعہ پر مجھے بکرم سنگھ یاد آتا ہے کمبخت امجد نے ایک دفعہ غلطی سے میرا اور اس کا تعارف کرا دیا تھا۔ اب اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہر میں رہنے کا بہت بڑا نقص یہ ہے کہ میری اور بکرم سنگھ کی ملاقات کسی گلی کے موڑ پر، کسی بازار کے نکڑ پر، کسی سینما کے دروازے پر ہو ہی جاتی ہے۔ مصافحہ ہونے کے بعد ہر دفعہ بالکل یہی مکالمہ ہوتا ہے۔

"اخاہ، آپ ہیں"

"او ہو کہیئے کدھر تشریف لیے جا رہے ہیں"

"کبھی ملیے تو سہی"

"لگا ہے کا ہے تو نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے"

"ہی! ہی!! ہی!!!"

"ہا! ہا! ہا!"

"اچھا، شکریہ"

"شکریہ!"

چلے جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ آخر انسان اس قدر بیوقوف کیوں ہیں۔ کہ تھیٹر سینما دیکھتے ہیں، یہاں تو اس دنیا کی سٹیج پر ہر کوئی شکسپیئر اور آغا حشر ہے۔

کبھی کسی سینما کے دروازے پر ایک صاحب۔

"ہیلو! ہیلو!"

"ہیلو! ہیلو!"

کیا آپ لاہور ہی میں ہیں (گویا یقین نہیں آتا) میں سمجھا تھا (دیوداس کا سا ایکٹنگ کر کے) آپ کہیں لاہور سے باہر چلے گئے ہیں (اب کوئی ان سے پوچھے کیوں بھئی یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں لاہور سے باہر چلا گیا تھا) آپ بی اے میں پڑھتے ہیں نا! (آج سے دو سال پہلے اسی سینما کے دروازے پر ملے تھے اور بالکل یہی گفتگو ہوئی تھی) بڑی مشکل سے ضبط کر کے جواب دیتا ہوں۔ نہیں جی میں نے تو بی۔ اے دو سال ہوئے پاس کر لیا تھا آج کل منٹو پارک میں

گنڈیریاں بیچتا ہوں۔

"اوہ ٹھیک یاد آیا، معاف کرنا — اوہ — اچھا پھر ملاقات ہو گی میں آج کل چنگڑ محلے رہتا ہوں، کبھی آیئے نا صفا چٹ لانڈری کے قریب۔

چلے جاتے ہیں۔

میری جان پہچان کے ایک اور بھلے مانس ہیں۔ ان کی اور میری واقفیت صرف دو فقروں تک محدود ہے۔ ان سے ملاقات گو بہت مختصر ہوتی ہے۔ مگر نہایت مہذبانہ طریق پر ہوتی ہے پہلے تو دور سے مسکرانا شروع کر دیتے ہیں جس کے جواب میں مجھے مسکرانا پڑتا ہے۔ میں یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ مسکراتے کیوں ہیں۔ قریب آ کر ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتے ہیں۔ پھر

"مزاج مبارک"

"مزاج مبارک"

اس کے بعد چند ثانیے پھر مسکراتے ہیں۔ اور پھر

"آپ ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں نا۔؟"

"جی ہاں"

مسکراتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ برسوں سے ملاقات ہے۔ کبھی اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے تو سودائی معلوم ہوتے ہیں۔

کہاں تک گنواؤں، میرے ہوسٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک بابو جی رہتے تھے، ان سے واقفیت صرف اتنی تھی کہ وہ کبھی مجھ سے بلیڈ ادھار لے لیا کرتے تھے۔ اور میں ان سے فونٹین پین کی سیاہی مانگ لیا کرتا تھا، اس کے علاوہ ان کا ایک قریبی رشتہ دار تھا، جو ایف۔ اے میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا بس میری تو شامت آ گئی۔ میں ذرا کمزور طبیعت کا آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ پانچ سال بورڈنگ کی روٹیاں کھا کر آخر میرے دماغ نے عدم تشدد کے فلسفے کو قبول کرلیا غریبوں پر بہت سی تہمتیں تراشی جاتی ہیں۔ ان صاحب نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

"جب وہ مرا ــــ"

(۱) اس نے سب دوستوں کو یاد کیا (چاہے بیچارے کو ہچکی لینے کا موقع بھی نہ ملا ہو، اور وہ اختلاج قلب ہی سے چل بسا ہو)

(۲) جی مرنے کے بعد اس کی صورت بالکل نہیں بگڑی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سویا ہے۔ آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی تھیں۔

(۳) جی اسے اپنے مرنے کا پتہ تھا۔ چھ مہینے پیشتر ہی سے وہ اداس سا رہتا تھا۔ نہ کسی کے ساتھ بولنا، نہ کھیلنا نہ ہنسنا جیسے موت سامنے کھڑی ہی، اُف آخری بار وہ مجھے ملا۔ پچھلے سال کی بات ہے۔ وہ مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا۔ یکایک اس نے مجھ سے پوچھا، کیوں بھئی رفیق کیا بجا ہوگا میں نے کہا ساڑھے آٹھ، کہنے لگا ساڑھے آٹھ، اُف ساڑھے آٹھ گاڑی ابھی تک نہیں آئی، اچھا مجھے اجازت دو۔ میں چلتا ہوں، دفتر جانا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی تھی۔ اتنا کہہ کر آپ چپ ہو گئے۔ میں نے تنگ آکر پوچھا، مگر اس کا مرنے سے کیا تعلق۔؟"

تعلق؟ آپ نے حیران ہو کر کہا "صاحب تعلق یہ ہے کہ اس واقعے کے دوسرے سال ، اسی دن عین ساڑھے گیارہ بجے مرگیا، ذرا خیال تو کیجیے، پورے ایک سال بعد، اسی دن اور ساڑھے آٹھ بجے کے پورے تین گھنٹے بعد ہی گاڑی آگئی اور اس نے ساڑھے گیارہ بجے مجھے لاہور پہنچا دیا۔ کتنی حیرت کی بات ہے۔

میں نے بالکل زچ ہو کر کہا۔ "خدا کے لیے اس بکواس کو بند کردو، اور آئندہ کبھی اس مرے کا رُخ نہ کرنا، ورنہ تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

یہ جان پہچان کے لوگ کسی غریب کی لاش کو خراب کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی کسی سے "جان پہچان" نہ رکھے، چند دوست بنائے اور بہت سے دشمن، ترقی کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی حربہ نہیں۔

اتنا لکھ چکنے کے بعد دل میں خیال آتا ہے کہ آخر میرے بھی بہت سے ایسے احباب ہوں گے جو مجھے فقط اپنی جان پہچان کے لوگوں کے زمرے میں شمار کرتے ہوں گے۔ اُف کتنی بھول ہوئی، اچھا جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے واپس لیتا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غُسلیات

بہت سے بچّوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے کی بلکہ اس سے بھی پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اُٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ اس آج زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ جس کے نام سے ڈاروِن کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پُرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکی ہیں، مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ نفرین رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بہت پُراُمید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے۔ انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں

چاہتا جو غسل خانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقے کے لوگ کافی تعداد میں ہر دو ہزار افراد کے لیے صرف ایک غسل خانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے چنانچہ محکمۂ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیار پور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں!

لیکن میں اپنے احباب کے نقطۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا، میں مستقبل کے متعلق اس قدر نااُمید نہیں ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفے پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پُراُمید ہونے کے لیے بہت سی وجہیں ہیں۔ انھیں بہ تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانے میں لوگوں کو غسلخانے سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول، عموی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جارہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جارہی ہے۔ اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لیے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ اور مہذب لوگ تو صرف "ڈرائی کلین" ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربیے کا دوسرے پوربیے سے کہنا۔ "ارے یار تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجیے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے، خودداری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی یہ بتا دے کہ وہ دن کے کتنے بجے نہاتا ہے تو میں وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لیے اسے ابھی کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ــــــ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبح چار بجے کون نہاتا ہے ؟ —— پوربیا ، بنیا ، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر ۔ !

صبح چھ بجے —— ڈاکیہ ، دفتر کا بابو ، پولیس کا سپاہی ،
آٹھ بجے —— پروفیسر ، کالج کا لڑکا ۔
دس بجے —— صاحب بہادر ، لیڈر
بارہ بجے —— منسٹر ، مجسٹریٹ ، رئیس اعظم

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے ۔ اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے ۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ اور ہاتھ پاؤں کو تر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں ۔ اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے اور پھر فخریہ لہجہ میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہانے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا ۔ اسی طرح یہ دن بھی آنے والا ہے جب کہ نہلانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی ۔ صرف یہ کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں ۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتے کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا ۔

آج تو ہم نے غسل کر لیا ۔ کتنی مدت کے بعد ۔ آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے ۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو ، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں " جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتے میں ایک دن ہمارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر ہمارے دادا جان ذکر

کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ واہ اس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا ۔ !

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا ، میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام نہیں کھلتے بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہونے کا احتمال رہتا ہے ۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی ۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتۂ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیے ، نہانے کی فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑ جاتا ہے ۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا ۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا ، مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں ۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے ۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے ۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے ۔ مبادا ہوا کا کوئی تند و تیز جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے ۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے ۔ اور قدرت کی کاری گری پر حیران ہوتے ہیں ۔ جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا کوئی اپنے پتلے کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہے ۔

ان کی سات بیویاں تھیں ، موٹی ، بانجھ اور بدصورت بیویاں ، وہ سب کی سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل دل میں کڑھتا رہتا۔ "ہونہ ہو میرے سوا اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے" وہ "اگر مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی۔ بھائی تو اس خیال سے قطعاً نہیں نہاتے تھے کہ جوں کہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں۔ جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہیے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے دریا پر گئی اور نہا کر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بنے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی "ناچوں کا لگتا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے، اور بیویاں بیوائیں بن گئیں۔ اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھوس کا بڑا سا جھونپڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ "اسے میں نہ دوں گا، اسے میں نہ دوں گا۔ یہ میری ہے۔ یہ میری ہے۔!"

نتیجہ۔ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سوال آنے درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے۔ اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس کے خلاف پرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا پروگرام کیا ہے۔ بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں یہ بھی سُن لیجیے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۱۴۴، الف میں یہ الفاظ ایزاد کیے جائیں۔

"ہر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ........ جو غریب شخص بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا، کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "بابو جی، غسل خانے میں پانی دیر سے دھرا ہے۔ آپ جلدی نہا لیں۔ ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

میں قلم چھوڑ کر میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

٭٭٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدصُورتی

اسے میری بد ذوقی سمجھئے یا عامیانہ روش سے بچ کر چلنے کی عادت بہر صُورت یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوب صورتی تو ایک عارضی شے ہے شفق کی طرح جلد مٹ جانے والی قوس قزح کی طرح گم ہو جانے والی لیکن وہ چیز جو ہمیشہ قایم رہتی ہے۔ وہ جس پر ہماری حیات بھروسہ کر سکتے ہیں، جس کے متعلق کوئی قطعی رائے قایم کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے بدصورتی اور اس دُنیا میں تو ہر شے چاہے اس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچ کر بالضرور بدصورت بن جاتی ہے پھُول مُرجھا جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں، شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے —— لیکن بدصُورتی ہمیشہ قایم رہتی ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک، تو پھر کیوں ان چیزوں کی طرف توجہ دی جائے جو عارضی ہیں۔ وقتی اور ناپائدار، اور بشر اپنے دل کو ان چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جن کی حیثیت ابدی و دوامی ہے جو کبھی بدل نہیں سکتیں، جن کی ہیئت میں کبھی انقلاب نہیں آ سکتا، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی صوفیانہ لغزش کا نتیجہ نہیں۔ ان کی اساس خالصتاً فلسفیانہ ہے، مذہب اور آرٹ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق

نہیں، خوب صورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصلاح ہے۔ جس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے۔ لیکن کسی بدصورت چیز کے متعلق ہر وقت اور یہی بدصُورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے، علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جزو لاینفک ہے اس کے بغیر خوب صورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی۔ جس کی بنیادیں بدصورتی پر استوار ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے بدصورتی بھی ایک طرح کا حسن ہی ہے آئین سٹائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دُنیا میں سُکھ ساتھ دُکھ پھول کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصورت مرد رہتے ہیں۔

روحانی نقطہ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں اصلی حسن صرف بدصورتی میں ہے۔ مثال کے طور پر آپ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صورت کی طرف توجہ کیجیے، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دنیا کے بڑے آدمی بنتے ہیں۔ بے چارے خوبصورت آدمی تو عام طور پر فوج میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصورت آدمی ان پر حکومت کرتے ہیں، دور کیوں جائیے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورتیں ملاحظہ کیجیے سوائے چند مستثنیات کے باقی سب وہ ہیں جنھیں دیکھ کر بے اختیار خُدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کیوں کہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدصورت آدمیوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس بیسویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لیے سیکڑوں طریقے برتے جا رہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے رہنما بڑے بڑے امیر فوج کے جرنیل، ادیب فلسفی، سائنس داں بیحد بدصورت واقع ہوئے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دراصل مجھے بدصورتی سے ایک گونا عشق سا ہو گیا ہے لوگ تو خوب صورت عورتوں پر مرتے ہیں۔ میں بدصورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں اور جب کبھی میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوانوں کی طرح جوان موقعوں پر "لڑکی کیسی ہے؟ خوب صورت ہے نا۔؟ قدو قامت؟ اور اس قسم کے سوالوں کا تانتا باندھ دیا کرتے ہیں۔ میں بھی اول جلول بکنے لگ جاتا ہوں۔ مثلاً۔

"لڑکی بدصورت ہے نا۔؟"

"ہاں۔"

لیکن محض "ہاں" میری تسلی نہیں ہوتی، چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں۔"

"کیا اس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماوس کی رات۔"

"ہاں، ہاں، اطمینان رکھو۔"

"اور دانت۔؟"

"میلے اور سُرخ! شاید پان بہت کھاتی ہیں۔"

"بہت خوب ...... اچھا...... مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں۔"

"آنکھیں؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بال بھی گھنگھریالے ہیں......"

"چچ...... چ...... چ...... میں ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہوں یہ تو بہت بری بات ہے۔"

اور اس طرح یہ ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص موجود تھا، کسی کا رنگ کھلتا ہوا تھا، تو کسی کی ناک ستواں کسی کی کمر پتلی تھی، تو کوئی سرو قد، غنچۂ اُمید کھلا، پر نہ کھلا اور گو اب میری عمر تیس سے کچھ اُوپر ہے، مگر پھر بھی پُر اُمید ہوں اور ایک

ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو کامل بدصورت ہو...... ایک بار!..... منٹو پارک لاہور کی نمائش میں ایک ایسی عورت دیکھی تھی، جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ "وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ" لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیاہتا نکلی۔

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جا سکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری، شاعر لوگ کہتے ہیں تو صرف حسین چیزوں کی تعریف میں۔ حسین عورتیں، حسین پھول، حسین وادیاں۔ بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگر مچھ کی شان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔؟ کسی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی۔؟ اگر نہیں تو بس پھر بدصورتی ایک بیکار شے ہے۔ کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان دلائل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ شاعر لوگوں سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کبھی سطحی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس اہم سوال کے حسن و قبح پر غور کر سکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے...... سبب کما کھاتے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیت سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو بلبلوں اور گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں کل کوے اور بھنگ کی کونپلوں پر طبع آزمائی کرنا شروع کر دیں۔ ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگوں کی ذہنیت میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو۔ لیکن میں اس پر بھی شاعروں کا اعتبار نہیں کروں گا۔ کیوں کہ شعر کہنا بذاتِ خود ایک خوب صورتی ہے اور خوب صورتی کا اعتبار کیا۔؟ خود شاعروں نے اپنے لاکھوں شعروں میں حسن کی بے وفائی اور خوب صورتی کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے، پھر یہ لوگ کس طرح خوبصورتی کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

خوبصورتی فساد کی جڑ ہے، اور پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کر آج تک خوب صورتی دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرتی چلی آئی ہے، خوب صورت چیزوں کے حصول کے لیے لوگوں نے اپنی جانیں گنوا دیں، تہذیبیں مٹ گئیں، اور قومیں فنا ہو گئیں، لیکن ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں کہ اسی جنون خیر وارفتگی سے پرانے راستے پر لڑھکے جا رہے ہیں خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی۔

اس دیوانگی کے جوش میں ہم نہیں سوچتے کہ امن عالم کیوں خطرہ میں ہے۔؟ وہ کیا چیز ہے جو اقوام عالم میں اتحاد نہیں پیدا ہونے دیتی۔؟ لوگ کیوں لڑتے ہیں۔؟ اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ دُنیا میں بنائے نزاع محض خوبصورتی ہے لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کے لیے خوبصورت خیالوں کے لیے، خوبصورت خطوں کے لیے، خوب صورت محلوں کے لیے خوب صورت ملکوں کے لیے۔ اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں، تو امن قایم ہو سکتا ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہم لوگ خوبصورتی کے مضر خواص سے واقف ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کے لیے زندگی کی اساس خوبصورتی پر تو نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورت قسم کی باتوں پر ہے۔ مثلاً روٹی، پانی، کپڑا........

رونا

مثل مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ "ہم سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے۔" کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں، گانا تو خیر کبھی کبھی سُن لیتے ہیں اور اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پر چلتے ہوئے، لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک محبوب و مرغوب مشغلہ ہے اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے۔ کہ آخری بار جب وہ روئے تھے اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ "اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔" پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے: "آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوئی ہے۔ تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یوں ہی رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں لوگ کیا کہیں گے۔"

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کہ ہر شریف انسان اسے برا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بے شک ایک اچھی چیز ہے لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت۔ بچپن میں جب ہم روتے تھے تو اکثر بار بار پچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے۔ بلکہ کوئی لوگ پچکارتے بھی نہ تھے۔ وہ کہتے تھے، اچھا ہے، خوب رو رو رونا بچوں کے لیے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو جائے تو لوگ اسے بزدل زنانہ مزاج، پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بے چارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں، یا ایک آدھ ہلکی سی چیخ بھی منہ سے نکل جائے تو اسے ہیجڑا کہہ دینے میں انھیں کوئی تامل نہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز جو بچوں کے لیے مفید ہے ان آدمیوں کے لیے جو اب بچے نہیں ہیں۔ کیسے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں کہ رونا بچوں کے لیے مفید ہے کیوں کہ اس سے چھاتی کھلتی ہے۔ پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ ناک کے نتھنوں سے ریزش جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا کشتی کرنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے۔ پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت تھی تو اب بڑھاپے یا جوانی میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے غالباً بچوں کے دن رات رونے کی وجہ ہی سے تپ دق نہیں ہوتی۔ اگر ہم لوگ بھی دن میں دو تین گھنٹے رو لیا کریں۔ تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نہ دمہ ہو نہ زکام، آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے کتنے بچے چشمہ لگاتے ہیں اور کون سا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمے کی حاجت نہیں محسوس کرتا۔ لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے سدھ مکردھوج، گولڈ پرلز، ماء اللحم، شربت فولاد استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان قیمتی دواؤں کے بجائے وہ قدرت کے بیش ترین اصول برتیں اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں تو جہاں جسم طاقت ور ہے

وہاں دن بھر دل میں امن و سکون بھی رہے اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لیے کس قدر مفید ہے۔ رونا جسم کی غذا ہے، نہ صرف جسم کی بلکہ روح کی بھی غذا ہے ایسی مفید عادت کے لیے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کے لیے عالمگیر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قایم کی جائیں سکولوں اور کالجوں میں رونا لازمی قرار دیا جائے۔ ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رو رہے ہوں۔ مثلاً ہٹلر مسولینی۔ چیانگ کائی شیک بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے۔ ذرا تصور کیجیے ایک بڑا سا سینما ہال ہے۔ جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رو رہے ہیں کتنا خوبصورت منظر ہے۔ کیا یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا، یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح رونا بھی بطور ایک ورزش کے سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے قریب میدانوں میں لاکھوں آدمی کھڑے کیے جائیں جو چیخیں مار مار کر روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنالیں، اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں مثلاً موسیقی کی طرح ملکۂ گریہ "رونے کا بادشاہ" وغیرہ وغیرہ اس پروگرام کو مقبول عام بنانے کے لیے سیکڑوں طریقے برتے جا سکتے ہیں۔ صرف نمونے کے لیے چند ایک یہاں درج کیے جا سکتے ہیں تاکہ سند رہے۔ باقی طریقوں کے لیے ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ بھیج کر راقم سے خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں، بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بعض بچے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں، اور اکثر گھنٹوں کیا کئی کئی دن روتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی کھاتے ہیں کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگاتار روتے رہتے ہیں۔ میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ کیا نہ کر سکیں گے۔ یوں بھی تو بذات خود یہ کوئی کم کارنامہ ـــــ نہیں اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر واٹرلو کی لڑائی، فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملے کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے۔ جیسے برسات کی بارش۔ ذرا استاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رو رو کر جھڑی لگا دی، ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا، ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش، پل میں دھوپ۔ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے عجلت پسندی اور غیر مستقل ارادوں کی۔ بس ان کا نام لڑکپن ہے اور شباب تو اس سے بھی برا ہے، اول تو جوان ہو کر لوگ روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں کوئی دیکھ پائے نہ سن سکے جیسے کسی گناہ قبیحہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یوں ہی کبھی کبھی رستم آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے کہ ہو ہو کر کے لبوں پر جھاگ لا کر آنسوؤں سے سفید داڑھی کو تر کر لیا جائے، یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی ہنسی اڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اور یوں بھی تو اس میں بڑھاپے کا کیا قصور ہے۔ دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر رونا انھوں نے بطور فن یا ورزش سے سیکھا ہوتا۔ تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے۔ رونا ایک ورزش ہے، رونا ایک آرٹ ہے مؤخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے۔ میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ دل میں رحم اور ہمدردی کا جذبۂ عمیق موجزن ہو جاتا ہے۔ اور وہ انھیں بازوؤں میں اٹھا کر پچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور عورتیں ــــ؟ رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک ملتجی نگاہ اور شاید آج کی دنیا کی تاریخ مختلف

ہوتی اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپک پڑتے یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن ایک معاشرتی انقلاب آجاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کم بخت مرد رونا نہیں جانتے۔ اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لیے جد و جہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے۔ اٹھو مجاہدو اٹھو، سرفروشی کی تمنا ــــ وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے کہ ہماری آزادی کی بہترین صورت رونا ہے۔ خوب روؤ جی بھر کر روؤ دن میں بار بار روؤ۔ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔"

٭٭٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیچلر آف آرٹس

بیچلر آف آرٹس! کتنا شاندار نام ہے۔ سُنتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ کسی انگریزی مٹھائی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ یا کوئی اعلیٰ اعزازی خطاب۔ "رائے صاحب" اور "خان صاحب" تو اس کے سامنے بالکل بے جان اور ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ بیچلر آف آرٹس! انھیں ادا کرتے وقت زبان بھی چٹخارے لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کتنے شاندار الفاظ ہیں۔ ہیبت اور جلال سے معمور۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کسی عظیم الشان عمارت کا نام ہے۔ ایسی عمارت جو تاج محل کی طرح خوب صورت اور قطب صاحب کی لاٹ کی طرح مضبوط اور بلند۔!

لیکن دراصل بیچلر آف آرٹس تو انگریزی مٹھائی ہے، نہ ہی کوئی اعزازی خطاب یا خوب صورت عمارت بلکہ یہ تو ایک غریب یتیم سی ڈگری کا پورا نام ہے جسے عرفِ عام میں "بی۔ اے" کہتے ہیں شاید آپ میری بات ماننے سے انکار کریں اور غصے میں آکر کہیں آج صاحب یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ کہاں بیچلر آف آرٹس جیسا حسین و قبول صورت نام کہاں بچارا غریب بی۔ اے ان دونوں میں کیا خاک مطابقت ہو سکتی ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی۔ واہ بہ۔

لیکن یہ ہے درست بیچلر آف آرٹس ہی بی۔ اے کا پورا نام ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔؟ کیا آپ اپنے گھر کے بہشتی فیض احمد خاں کو "بھیجا" کہہ کر نہیں

پکارتے۔ دفتر کے چپراسی منگل سنگھ کو "منگلو" چندر روشن کو "چندرو"۔ پھر اگر زمانے کے چکر سے بیچلر آف آرٹس سمٹ کر اور سکڑ کر صرف بی۔ اے رہ جائے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ غربت میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب بی۔ اے کی معنوی حالت ایسی نہ تھی۔ جیسی اب ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی ہم میں سے بہت سے نوجوان پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور شاید شاہ جارج پنجم کی ابھی دہلی میں ابھی تاج پوشی بھی نہ ہوئی تھی تو ان دنوں سُنا ہے کہ بی۔ اے کی ڈگری کا بہت رعب تھا۔ ہمارے محلے میں ایک بوڑھے ڈپٹی صاحب رہتے ہیں بڑے بھلے مانس ہیں۔ متین صورت سفید ریش اور آنریری مجسٹریٹ۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کہنے لگے میاں صاحبزادے میں دیکھتا ہوں تم آج کل اداس سے رہتے ہو اور اکثر آوارہ پھرتے رہتے ہو، لیکن جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو بی۔ اے پاس کرکے فوراً تحصیلدار بن گئے تھے ان دنوں ہمارے پتا جی گلیوں میں آلو چھولے گرما گرم بیچا کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنا اور گاہکوں کا پیٹ کاٹ کر پڑھایا، اور ایک تم ہو کر بی۔ اے پاس ہو، ملازمت ابھی تک کہیں نہیں ملی اور ہر وقت ہیٹ بوٹ سوٹ ڈانٹے رکھتے ہو اس طرح پندرہ بیس منٹ وہ لمبا چوڑا وعظ سناتے رہے اور جب چپ ہوئے تو میں نے نہایت نرمی سے اور برخوردارانہ انداز میں سر جھکا کر کہا، حضور آپ نے کس سن میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے آنکھیں بند کرکے اور حافظے پر زور دے کر کوئی سال بتایا۔ وہ سن اب مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں اٹھارہ سو کیا؟ لیکن بہرحال وہ سن قبل از مسیح نہیں تھا اور اس کی رومانی داستانیں غالباً آپ نے بھی سُنی ہوں گی ایک رنگریز کا بیٹا جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ولایت بھیج دیا گیا اور وہاں سے واپس آنے پر فوراً چیف انجینئر بن گیا ایک پنواڑی کا صاحبزادہ جو ایک دن اپنے باپ کا حاکم بنا اور جسے انجام کار اپنے باپ ہی کو رشوت ستانی کے الزام میں ملازمت سے برطرف کرنا پڑا۔ ایک غریب تیلن کا بچہ جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آئی سی ایس بنا اور جس کے ڈرائنگ روم میں آج بھی ایک چھوٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساچاندی کا کولہو بطور یادگار مینٹل پیس پر رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک گنڈیری بیچنے والا لڑکا ایک خانساماں کو نواسا .... پرانے زمانے کی عجیب و غریب حکایتیں دل چسپ شیریں اور پر کیف۔ جنھیں پرانے زمانے کے پنشن یافتہ بزرگ یا بڑی بوڑھی خالائیں سردی کے دنوں میں، انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر کم عمر اور خام عقل اندر گر بچیوں کو سنایا کرتی ہیں، یہاں انھیں "بی، اے" کی کہانیاں" کہا کرتا ہوں۔ اور یہ بی، اے کی کہانیاں اتنی ہی میٹھی اور دلنواز ہوتی ہیں جتنی الف لیلیٰ کی داستانیں اور اتنی ہی حیران کن انھی افسانوں کو سُن کر بے چارے غریب اندر گریجویٹ نئے نئے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔ خوب صورت ہوائی قلعے۔ کبھی عالم خیال میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ارد گرد وکلاء اور بیرسٹر "مائی لارڈ" "مائی لارڈ" کہہ کر کورنش بجا لا رہے ہیں یا وہ کپتان پولیس بن گئے ہیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر بازار سے گزر رہے ہیں۔ ان کی دستار کا سفید طرہ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اور لوگ اس سفید پر چم کو جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں۔ یا پھر وہ آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں چوتھے نمبر پر آئے ہیں۔ والد کو اتنی خوشی ہوئی ہے کہ انھوں نے شہر کے سارے بینڈ اپنے گھر کے دروازے پر اکٹھے کر لیے ہیں......

مگر نہیں یہ سب دھوکا ہے۔ دھوکا اور مایا۔

یہ کچھ تو ان بی۔ اے کی سُنی سُنائی کہانیوں کا اثر ہوتا ہے۔ اور کچھ جوانی کی ابلتی ہوئی مستی کا کہ بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد کچھ عرصہ تک ایک نوجوان کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری رہتا ہے اور اپنے تئیں ایک بہت بڑا انسان سمجھتا ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ میں بی۔ اے کے امتحان کی اہمیت واٹرلو کی لڑائی، سکندر کے حملے، اور ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم سے کم نہیں ہوتی۔ وہ جب گھر والوں سے بات کرتا ہے تو اس طرح ایک باوقار مہذب مجلسی طریق پر گویا وہ خود اپنے ہی گھر میں ایک مہمان ہے۔ آداب نشست و برخاست میں اس کی کیفیت اور بھی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ مثلاً جب کرسی پر بیٹھتا ہے۔ تو اس طرح تنتا ہوا اور چوکنا ہو کر گویا وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے اور اسے ہر لحظہ وہاں سے گر پڑنے کا اندیشہ

ہے۔ انھیں کی چھاتی اور گردن کا تناؤ ان دنوں اتنا شدید ہوتا ہے کہ بے چاری ماں اسے بار بار پوچھ لیتی ہے۔ کیوں بیٹا وحید تمھاری گردن کو کیا ہوا ہے کہیں کوئی بل تو نہیں پڑا ہے لاؤ ذرا مالش کردوں، جس سے بیٹا وحید اور بھی چڑ جاتا ہے۔ اور جب وحید بازار میں نکلتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے جسم کے روئیں روئیں پر "بی، اے" لکھا ہے اور لوگ اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، لو دیکھو وہ جا رہا ہے عالی ہمت نوجوان جس نے اس سال بی، اے پاس کیا ہے۔

لیکن یہ ہذیانی کیفیت زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہتی اور اس امر کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے کاش آپ اس روز یونیورسٹی کے ہال کے دروازے پر کھڑے ہوتے کہ جس روز میں وہاں سیاہ گون میں ملبوس۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے ہاتھ میں بی۔ اے کی ڈگری لیے خراماں خراماں باہر نکلا دس نومبر سنہ ۱۹۳۶ء کی سہاونی صبح تھی اور یونیورسٹی ہال کے پرانے کلاک سے لے کر تانگے والے کی آواز تک دُنیا کی ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ انار کلی کے دوکاندار بھی ہمیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور بے اختیار ہنس رہے تھے۔ ہم لوگ ٹولیاں بنائے ریشمی گونوں کی سرسراہٹ کی موسیقی کو سُنتے ہوئے انار کلی بازار میں گئے اور فوٹو کھینچنے والوں کی دوکانوں میں گھستے گئے۔ یہاں کتنی بھیڑ تھی، کتنا شور و غل ہر طرف سیاہ گون دلچسپ باتیں اور بلند قہقہے چیریو اور ہائی ڈیر کی آوازیں تصویر کھینچ والی پھر راستہ میں ایک رُئیٹنگ پیڈ کے لیے بھی آرڈر دیا گیا لالہ پیڑا رام بی، اے ملک اللہ بخش بی، اے، سردار لچھمن سنگھ بی، اے غرض نام سے نہیں بلکہ لفظ بی، اے کی نمائش سے تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کیفیت زیادہ دیر تک قایم نہیں رہتی، یہ گھر والوں کے چاؤ چونچلے، دوستوں، بزرگوں اور رشتہ داروں کی دلداریاں چند روز تھیں، چند دنوں تک ہماری دلداریاں ہوتی رہیں۔ قرض کے پردے میں دلداریاں ہوتی رہیں اور چند دنوں تک ہم نے بھی یہی سمجھا کہ اب ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم آیا کہ سرکار تمھارے بی، اے کی ڈگری حاصل کرنے پر بہت خوش ہے اور عالی ہمتی کے صلے میں وہ تمھیں تحصیلدار یا ڈپٹی یا پولیس کپتان کا عہدہ سونپتی ہے لیکن جب دن کیا مہینے گزر گئے اور سوائے ایک سائیکل کے چالان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اور کوئی سرکاری پروانہ نہ آیا تو ہم نے سوچا اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ کوشش کرنی چاہیے عین ممکن ہے کہ سرکار کو ہمارے بی، اے پاس کرنے کا پتہ ہی نہ ہو۔ اتنی بڑی سرکار ہے اور آخر انھیں اور بھی بہت سا انتظام کرنا پڑتا ہے، وغیرہ وغیرہ تو اسی طرح سوچ سمجھ کر آخر ہم آئی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے۔

وہاں جا کر پتا چلا کہ بقول حضرت علامہ مرحوم ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہاں بی، اے سے بھی کچھ اوپر ڈگریاں ہیں اور ان کے مالک بھی یہاں امتحان کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ دل میں کچھ مایوسی سی ہوئی اسی تذبذب میں پرچے بھی اچھے نہ ہوئے اور رہی سہی کسر انٹرویو نے پوری کر دی، یہ انٹرویو بھی عجیب بلا ہے۔ ہم نے یہ مضمون بی، اے میں کا ہے کو پڑھا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں بطور احتیاط والد صاحب کی سونے کی گھڑی ساتھ لیتا گیا تھا جو انھیں انعام میں ملی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیسی زک اٹھانا پڑتی، انٹرویو کمیٹی کے صدر بہت مہربان طبیعت کے مالک تھے۔ مجھ سے نہایت نرمی سے کہنے لگے تمھارا نام کیا ہے؟ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا نام بتایا تو کمیٹی کے ایک صاحب جھٹ بول اُٹھے ڈرتے کیوں ہو۔ کُھل کر بات کرو یہاں تمھیں کوئی کھا تو نہیں لے گا۔

میں نے کہا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرا باپ اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔

کمیٹی کے ممبروں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر جب میری خاندانی خدمت کا سوال آیا تو میں نے جھٹ جیب سے گھڑی نکال کر سامنے رکھ دی۔

یہ کیا ہے۔؟ صاحب صدر حیران ہو کر بولے۔

یہ ایک گھڑی ہے میں نے جھٹ جواب دیا۔

ہاں، ہاں۔ یہ تو میں بھی دیکھتا ہوں کہ یہ ایک گھڑی ہے۔

میں نے مُسکرا کر کہا، جناب والا یہ گھڑی سونے کی ہے، اور میرے والد کو انعام میں ملی ہے۔

بہت خوب ایک ممبر نے پوچھا۔ کوئی اور خدمات ——

میں نے کہا لڑائی میں میرے دادا کے دادا کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی۔

اس کا کوئی ثبوت کوئی سارٹیفکیٹ!

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا سارٹیفکیٹ تو کوئی نہیں لیکن دادی اماں نے مجھ سے یہ بات اکثر بیان کی ہے کہ میرے دادا کے دادا ....

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہنس پڑے آخر صاحب صدر نے مجھ سے کہا YOU CAN GO NOW

میں جیب میں گھڑی ڈال کر باہر نکل آیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب آئی۔سی۔ایس کا نتیجہ نکلا تو میرا نام بھی موجود تھا لیکن دو سو ننانوے نمبر پر۔

آئی۔سی۔ایس کے امتحان کے بعد بیچارا غریب بی، اے کئی چکر کاٹتا ہے اور کئی پاپڑ بیلتا ہے۔ کبھی انٹرویو میں فیل کبھی باقی پرچوں میں صفائی۔ فوج اور پولیس میں کوشش کی تو قد چھوٹا نکلا۔ یا اگر قد ٹھیک تھا تو چھاتی "چھوٹی نکلی"۔ غرضیکہ ہر طبی معائنے پر اس کے جسم میں کوئی نہ کوئی نیا نقص ضرور نکل آتا ہے۔ آئی۔سی۔ایس میں اس کی آنکھیں کمزور تھیں۔ پی۔سی۔ایس میں اس کے پھیپھڑے مضبوط نہ تھے جب تحصیلداری کے امتحان میں پہنچا تو اسے اختلاج قلب کا دورہ پڑنے لگا۔ اور آخر جب وہ سرکاری کلرکوں کے امتحان میں شریک ہوا تو ڈاکٹروں کی کمیٹی نے بتایا کہ اسے ضعف دماغ کی شکایت ہے اور عین ممکن ہے کہ چند مہینوں میں پاگل ہو جائے۔ ان مرحلوں سے گزر کر اسے پتہ چلتا ہے کہ محض بی، اے کی ڈگری تو ایک نعمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حقیر سی شے ہے۔ یہاں قد چاہیے جسم اور صحت فوجی اور سول خدمات نشست و برخاست کے صحیح آداب، خاندانی وجاہت، دولت اور رئیسانہ اہتمام۔ وہ دن لد گئے کہ جب باپ آلو اور چھولے بیچتا تھا۔ اور بیٹا بی۔ اے ہو کر جھٹ ڈپٹی بن جاتا تھا۔ اب تو یہ حالت ہے کہ باپ اگر ڈپٹی ہے تو بیٹا آلو چھولے بیچ رہا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے میرے محلے کے ڈپٹی صاحب پھر مجھ سے ملے۔ ان کے لڑکے نے حال ہی میں بی۔ اے پاس کیا ہے مجھ سے کہنے لگے۔

"میاں تم نے تو بہت سے مقابلے کے امتحان دیکھ لیے ہیں کچھ ہمیں بھی صلاح دو صاحبزادے کو کہاں بھیجیں۔

میں نے عرض کی قبلہ اسے کسی مقابلے کے امتحان میں مت بھیجیے گا۔"

تو پھر کیا کروں، ڈپٹی صاحب نے جھلا کر کہا اسے اتنا پڑھایا ہے بی، اے ہے۔

میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ ڈپٹی صاحب! آپ کے سوا خاندان بھر میں اور کسی فرد کی بھی سرکاری خدمات ہیں۔

ڈپٹی صاحب رک رک کر بولے۔ اوں .... نہیں .... تو لیکن سنا ہے کہ ہمارے ایک بزرگ نے غدر میں ایک افسر کی جان بچائی تھی ...... کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ لیکن اگر کوشش کروں تو ......

میں نے کہا۔ "وہی میرے دادا کے دادا کی ٹانگ والا قصہ ہے۔"

ڈپٹی صاحب بولے کیا کہا آپ نے۔؟

میں نے جواب دیا کچھ نہیں۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ اسے مقابلے کے امتحان میں نہ بھیجیے اور آگے پڑھانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ بی۔ اے کی ڈگری محض ایک بیکار سی شے ہے۔ اسے کسی تجارتی کاروبار میں لگا دیجیے۔ جوتوں کی دوکان ......

جوتوں کی دوکان! ڈپٹی صاحب نے غصے سے کہا۔

یا کوئلوں کی دوکان میں نے آہستہ سے کہا۔

ڈپٹی صاحب فرش پر تھوکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تو یہ ہے بی۔ اے کی داستان، رنج و عبرت کا مرقع اسے سن کر بی۔ اے والوں کی حالت پر چاہے ہنسئے، چاہے روئیے لیکن ہنسنے کے وقت یہ یاد رکھیے کہ بی۔ اے مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ اور آج کل بی۔ اے عورتوں کی حالت اتنی ہی ناگفتہ بہ ہے جتنی بی۔ اے مردوں کی وہ زیادہ سے زیادہ کسی گرل سکول میں ملازم ہو جاتی ہیں اور دن بھر لڑکے لڑکیوں کو کھلاتی پڑھاتی رہتی ہیں۔ ننھے ننھے لڑکے بسورتی ہوئی لڑکیاں اور الف بے تے کی مہارانی، بس انہی دھندوں میں پھنس کر بیچلر آف آرٹس ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کو بی۔ اے والوں کی حالت پر ہنسی آئے تو یہ امر ذہن میں رکھ لیجیے کہ ان میں بی اے عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر تہذیب آپ کو اجازت دے تو شوق سے ہنسئے۔

* * *

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی

راوی روایت کرتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء میں موضع کاٹھن ماموں ضلع لائلپور کے قریب ایک بہت بڑی سرکاری رکھ ہوا کرتی تھی ۔ ایک دن دوپہر کو کہ جب موضع کا ہر دیہاتی اپنے گھر میں آرام سے سویا ہوا تھا ایک گبرو نوجوان جو اسی موضع کا رہنے والا تھا اپنے گھر سے نکل بھاگا بھاگتے بھاگتے وہ سرکاری رکھ میں جا نکلا اور پھر یکایک ایک بہت بڑے کیکر کے درخت سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگا۔

درختوں کی شاخوں سے سرسراہٹ سی پیدا ہوئی ۔ پھر شاخیں آہستہ سے اس نوجوان کے سر پر جھک گئیں ۔ اور اس کی پیشانی پر دست شفقت پھیرنے لگیں ۔ مگر اس طرح کہ نوجوان کو کیکر کے کانٹے بھی نہ چبھنے پائے۔

درخت نے نہایت شیریں آواز میں پوچھا ۔ اے نوجوان تو کیوں روتا ہے ؟ کیا تجھے کسی نے ایذا دی ہے ۔؟ بول تجھے کیا تکلیف پیش آئی ہے ۔ ؟

وہ آواز اتنی مترنم اور لوچدار تھی کہ نوجوان کی آہ وزاری بجائے کم ہونے کے اور بھی تیز ہو گئی ۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"میں موضع کاٹھن ماموں کا رہنے والا ہوں "

"تو پھر کیا ہوا ۔ درخت نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ۔ موضع کاٹھن ماموں کوئی اتنا بڑا قصبہ نہیں ۔ وہاں کئی بھلے مانس رہتے ہوں گے "

"اور بی ۔ اے پاس ہوں ۔ پچھلے سال ہی ڈگری حاصل کی ہے ابھی تک بے کار ہوں "

خالص ہاں "ہے تو سہی "

"تو پھر گھبراتے کیوں ہو ۔ تھوڑا سا شہد ڈگری پر لگا کر ہر روز چاٹا کریں ۔ بے کاری دور ہو جائے گی ۔ مجرب نسخہ ہے اور آزمودہ ...."

مگر میں بے کاری دور کرنا نہیں چاہتا ۔ نوجوان نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ۔ بے کاری تو ایک لمحہ میں دور ہو سکتی ہے مگر ۔ مگر آپ سے کیا چھپاؤں ، بات دراصل یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں "

"شادی ۔ ؟" درخت کی شاخیں ایک دم بول اٹھیں ۔

"جی ہاں بات یہ ہے کہ پہلے میں شادی کرنا نہیں چاہتا تھا ۔ اور ماں باپ شادی پر بہت زور دیتے تھے ۔ بیٹا شادی کر لو ۔ دیکھو عزیز احمد نے شادی کر لی ہے وہ عمر میں بھی تم سے بہت چھوٹا ہے اور اب اس کے ہاں دو بچے ہیں جب سے اس کی شادی ہوئی ہے ۔ وہ بے کار بھی نہیں رہا ۔ یہ عورتیں جب دوسروں کے گھر آتی ہیں تو اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں ۔ نہ کہ اسے میکے چھوڑ آتی ہیں ۔ یہ اپنے خاوندوں کی سوئی ہوئی قسمتوں کو بھی بیدار کر دیتی ہیں ۔ متھو رام کی زوجہ کی طرف دیکھو جب سے سسرال آئی ہے گھر میں روپے کی ریل پیل ہو گئی ۔ پہلے گھر میں بھنگ بھی نہیں ملتی تھی ۔ لیکھ رام کی عورت نے اپنے سڑیل خاوند کو کتنا خوش مذاق بنا دیا ہے ۔ جب دیکھو ہنستا رہتا ہے ۔ کیوں نہ ہو اس کی بیوی وفا شعار ہے ۔ اس کے لیے کھانا پکاتی ہے بچے جنتی ہے ۔ کپڑے سیتی ہے ۔ محلے والوں سے لڑائی مول لیتی ہے تم بھی شادی کر لو ۔ دل میں حسرت ہے میرے گھر بھی ایک خوبصورت سی بہو آئے (ہاتھ پھیلا کر) یہ تھ ہو اتنی بڑی سائیکل کے پہیے جیسی پاؤں میں پازیب انگوٹھے پر آرسی ، ناک میں بلاک ، یہ گھونگھٹ ہو اتنا لمبا ، شرم سے بات کرنے میں گھرکیاں دیتی جاؤں وہ چپکے سنتی رہی ۔ بیٹا شادی کر لو ۔ شادی اماں کی بات نہ ٹالو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دیکھو تمھارا باپ کس افسردگی سے حقہ پی رہا ہے۔ اس کی حالت پر رحم کرو۔

درخت نے پوچھا اور اب کیا حالت ہے۔؟

کس کی۔؟ میرے باپ کی۔؟

نہیں تمھاری۔

کہتا تو ہوں۔ نوجوان نے رومال نکال کر ناک صاف کرتے ہوئے کہا پہلے وہ شادی کرنا چاہتے تھے اور میں انکار کرتا تھا۔ پھر بی۔ اے میں مجھے وظیفہ مل گیا۔ بیس روپے ماہانہ اور گھر والے میری شادی کے متعلق سب کچھ بھول گئے۔ انھیں وظیفہ کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ مجھے دن رات کتابوں میں گھرا ہوا دیکھنا پسند کرنے لگے۔ جوں جوں میں پڑھائی سے اکتا کر شادی اور عورت اور بچوں کا دھیان کرنے لگا وہ پڑھنے پر مصر ہونے لگے کہنے لگے تمھیں لاہور بھیجیں گے۔ جب تم بی۔ اے پاس کرو گے وہاں بھی تم وظیفہ لوگے پھر تو ہیڈ ماسٹر بنو گے پھر ہر مہینے تم بہت سی تنخواہ گھر لاؤ گے۔ اور پڑھو بیٹا اور پڑھو۔ خوب محنت سے کام لو۔ دیکھو ہم کتنے غریب ہیں اور وہ کمبخت پٹواری کتنا امیر ہے۔ یہ بات مجھے آج سمجھ میں آئی کہ لوگ اپنے بچوں کو کیوں پڑھاتے ہیں۔

اب انھوں نے میری شادی کا خیال بالکل ترک کر دیا اور ادھر میری یہ حالت تھی کہ میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں اب جوان ہو گیا تھا اور راہ چلتی عورتوں پر یا کنوؤں پر پانی بھرتی ہوئی لڑکیوں پر یا کھیتوں میں کام کرتی ہوئی دیہاتنوں پر للچائی نگاہیں ڈالنے لگا تھا اور اب وہ مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ درحالیکہ اس سے پہلے میں ان کی بے ڈھنگی چال پر اور ان کی گھریلو اور لسوانی گفتار پر ہنسا کرتا تھا۔

چنانچہ میں نے یہ بہتر سمجھا کہ گھر والوں کو اپنے عندیہ سے آگاہ کر دوں کالج میں کرسمس کی چھٹیوں کے ایام ہیں۔ میں کانجن ماموں گیا اور باتوں باتوں میں اماں اور ابا سے ذکر کیا۔ مثلاً۔

ابا وہ تھا نہ جو ظہیر۔ محمد افضل پرانے کوٹھے والے کا لڑکا اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اور ابا حقہ پیتے پیتے آہستہ سے سر ہلا کر کہتے ہو گئی ہوگی۔

ابا اور وہ جو میرا ہم جماعت تھا رتن ورما اس کی بھی شادی ایک مہینہ ہوا لاہور ہو گئی ہے بڑی اچھی بیوی ملی ہے۔ جہیز بھی بہت ساتھ لائی ہے۔ میں اس کی شادی پر گیا تھا۔

لیکن اماں چرخے کی گھوں گھوں کے ساتھ جواب دیتیں۔ شادیوں کا کیا ہے بیٹا ہوتی رہتی ہیں۔ بس نہ جانے ان لوگوں نے کیا سازش کر رکھی تھی۔ پہلے اگر میں اتنی بات کرتا تو فوراً میری شادی کے تذکرے چھڑ جاتے تھے۔ مگر اب؟ پہلے اماں ہر روز مجھے ان کرسمس کے ایام میں کہا کرتی تھیں۔ بیٹا تم بہت کمزور ہو گئے ہو یہ کمبخت ہوسٹل کی روٹیاں دبلا کیے بغیر نہیں چھوڑتیں۔ بیٹا شادی کیوں نہیں کر لیتے پھر لائلپور میں تمھیں ایک علیحدہ مکان لے دیں گے۔ مگر اب کرسمس کے دنوں میں اماں نے تو یہ کہہ دیا کہ اب تمھاری صحت پہلے سے اچھی نظر آتی ہے۔ میں بہت خوش ہوں پڑھنے والے آدمیوں کو اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

اور ابا حقہ پیتے پیتے کہتے۔ ہاں ٹھیک تو کہتی ہیں تمھاری اماں صبح سیر کرنے جایا کرو۔ یہ لیجیے اب شادی سے سیر پر آ گئے۔ کل کو اگر خدا نخواستہ ایک وظیفہ اور مل گیا۔ تو سیر بھی بند کر دی جائے گی۔ اور کہا جائے گا۔ بیٹا سیر کرنے نہ جایا کرو۔ آرام سے بستر پر لیٹا رہا کرو۔ اور اپنی کتابیں پڑھتے رہا کرو۔ سیر کرنے سے صبح ہوا لگ جانے کا اندیشہ ہے اور زکام اور انفلوئنزا اور نمونیا اور نہ جانے کیا کیا بیماری لاحق ہو سکتی ہیں۔ بیٹا سیر کرنے نہ جایا کرو گھر پر ہی تھوڑی سی ورزش کر لیا کرو۔

ایک دن میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ابا! میری صحت پہلے سے تو اچھی نہیں، ہاں گھر آ کر ضرور اچھی ہو گئی ہوگی، وہاں ہوسٹل کی روٹیاں۔ اور مجھے پیچش بھی ہوئی، مگر اماں نے بات کاٹ کر کہا۔

ہاں بیٹا ہوسٹل کی روٹیاں تو پھر تم جانتے ہی ہو۔ پڑھائی میں یہ صعوبتیں تو دیکھنا ہی پڑتی ہیں۔

ہر وقت پڑھائی پڑھائی، شادی کا ذکر ہی نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے تنگ آکر یہ فیصلہ کیا کہ بی۔ اے کے بعد نہ پڑھوں گا۔ چنانچہ اب بی۔ اے کے بعد والدین نے بہت زور لگا کر مجھے آگے بڑھایا جائے۔ مگر میں نے ایک نہ مانی۔ اب حالت یہ ہے کہ میں گھر پر بے کار بیٹھا ہوں۔ نہ ہی نوکری ملتی ہے اور نہ بیوی۔ مصیبت عجیب مصیبت ہے۔"

آخر تمھارے والدین تمھاری شادی کیوں نہیں کرتے۔ درخت نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

"میری شادی تو وہ کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ نوجوان نے جواب دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اماں گاؤں کے کمہار کی لڑکی سے میری نسبت کر دینا چاہتی ہیں اور ابا کو کمہار کا یہ رشتہ پسند نہیں وہ پٹواری کی لڑکی سے رشتہ کے خواہاں ہیں۔ اپنے لیے نہیں میرے لیے گو میرے خیال میں انھیں ایک بیوی اور مل جائے تو غالباً بے جا انکار نہیں کریں گے مگر حالت یہ ہے کہ اب میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ارے!" درخت نے جھلا کر کہا۔ "ابھی کہہ رہے تھے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں اور اب انکار کر رہے ہو۔ یہ کیا بات ہے۔؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ شادی کرنا چاہتا بھی ہوں۔ اور نہیں بھی مجھے تو نہ کمہار کا رشتہ پسند ہے اور نہ وہ پٹواری کی سانولی لڑکی بلکہ مجھے تو گاؤں کے لوہار کی لڑکی پسند ہے۔ وہ جس کی موٹی موٹی آنکھیں ہیں اور ایک عجیب ادا سے ہنستی ہے۔ بس میں اسی ادا پر فریفتہ ہوں۔ جی چاہتا ہے وہ سامنے بیٹھی رہے اور میں اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھتا رہوں اور اس کی عجیب ہنسی سنتا رہوں۔

اچھا تو کیا یہ سچ ہے" کیکر کی شاخوں نے ہنستے ہوئے کہا کتنی عجیب ہنسی تھی۔ کیا تم سچ مچ اس سے شادی کرنا چاہتے۔ اس لوہار کی لڑکی سے۔"

نوجوان نے عقیدت مند نظروں سے کیکر کے درخت کی طرف دیکھا اور اس کے تنے کو ایک بوسہ دیا اور مذہبی جوش سے بولا یہ سچ ہے اے کیکر کے درخت

میں اس نیلے آسمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے۔ میں اس لوہار کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، مگر کیا کروں تین دن ہوئے وہ لڑکی گاؤں سے گم ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اس لیے اے کیکر کے مقدس درخت کہ جس کی چھال سے جاٹ لوگ اپنے لیے تیز و تند شراب بناتے ہیں میری مدد کر۔

نوجوان یہ کہہ کر کیکر کے تنے سے زور کے ساتھ لپٹ گیا۔ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، کیکر کی شاخیں جھومنے لگیں، پھر شاخوں کی سرسراہٹ آہستہ آہستہ ایک عجیب دل کش ہنسی میں تبدیل ہوتی گئی، یکایک نوجوان نے کیا دیکھا ایک لوہار کی لڑکی کھڑی ہنس رہی ہے اور وہ اس کے پاؤں پڑا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"میری جان۔!" اس نے لوہار کی لڑکی کو گلے لگا کر کہا۔ تم یہاں کہاں۔؟

لوہار کی لڑکی نے شرما کر کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پٹواری کو تمھاری محبت کا پتہ چل گیا تھا چنانچہ اس نے تین دن ہوئے مجھ پر افسوں پڑھ کر مجھے ایک کیکر کا درخت بنا دیا اور اس رکھ میں بھیج دیا۔ تاکہ تم مجھے پہچان نہ سکو۔ مگر آخر میری محبت تمھیں یہاں کھینچ لائی۔ اور محبت کے سب سے طاقتور جادو نے مجھے پٹواری کے سحر سے نجات دلائی۔

"ہاں! ٹھیک ہے میری جان" نوجوان نے رومال نکال کر ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

راوی بیان کرتا ہے کہ اس داستان کو بیتے ہوئے آج سات سو برس ہو چکے اب اس اٹھائیسویں صدی کی ہوائی تہذیب میں اس پرانی زمینی تہذیب کے پرانے افسانوں کو کون پوچھتا ہے۔ آج کل لوگ ہوائی شہروں میں رہتے۔ ہوائی ہوٹلوں میں کھاتے پیتے اور ہوائی طیاروں میں سیر کرتے اپنی زندگیاں بسر کر دیتے ہیں۔ اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی بھولے سے بھی اپنی مادرِ وطن زمین کا منہ نہیں دیکھتے کہ جہاں ہمارے اسلاف کی شجاعت اور صنعت اور الفت و محبت کے کارنامے نصب ہیں۔ حیف ہے اس تہذیب پر۔ کابخن ماموں کے لوہار کی لڑکی اور نوجوان کی محبت کا افسانہ اتنا مشہور ہوا کہ کابخن ماموں کے پاس ہی لائلپور کے قریب "پریم نگر" نام کا ایک نیا شہر بسایا گیا اور اس شہر کے وسط میں اس لوہار کی لڑکی اور نوجوان کے لیے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا گیا۔ افسوس کہ آج وہ شہر ایک کھنڈر بن کر رہ گیا ہے اور غالباً اب وہاں بہت سے کیکر کے درخت اُگ آئے ہیں۔ سوچتا ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہماری اس ہوائی تہذیب نے اس سحر اور رومان کو ہماری زندگیوں سے لے کر خارج کر دیا ہے۔ ہمارے نوجوان لوہار کی لڑکیوں سے محبت نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی درختوں کی خوب صورت باتوں کو سنتے ہیں۔ آج کل تاروں سے محبت جتائی جاتی ہے۔ اور ہماری بیویاں ہسپتالوں میں جا کر بچے جنتی ہیں۔ سوچتا ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

❖ ❖ ❖

عشق اور ایک کار

کل رات تعلیم یافتہ بے کاروں کے کلب میں اوپندر نے محبت کے موضوع پر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی۔ محبت ایک جذبۂ الٰہی ہے خدا اور سورج کی طرح محبت بھی نسل، قوم، ملک اور رنگت کی تمیز سے بالاتر ہے اور امیر اور غریب کو یکساں مسرت بہم پہنچاتی ہے۔ "آہ!" اوپندر نے آنکھیں اوپر چڑھا کر ایک حسیاتی لہجہ میں کہا۔ "محبت تو فرشتوں کا جذبہ ہے کل کائنات پر محبت کی حکمرانی ہے۔ محبت خدا کا بہترین عطیہ ہے۔ جو اپنی مخلوق کو بخشا گیا ہے۔ کل کائنات کا نظام محبت پر قائم ہے۔ آہ! محبت!" یہ کہہ کر اوپندر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور چپ ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس کی تقریر کے بعد کلب کے کسی دوسرے ممبر کو تنقید و تبصرہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ کم از کم اس کی جرأت آموز خاموشی یہی کہے دیتی تھی۔

یہ خاموشی چند ثانیوں تک طاری رہی پھر راجندر نے دھیمے لہجہ میں کہا "تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اوپندر! کیا کسی نے کوئی نیا تحفہ بھیجا ہے۔ کل تمہارے ہاں لکھنے کے ٹیبل پر میں نے ایک خوب صورت منقش میز پوش دیکھا تھا۔ کیوں نہ؟" اس پر اوپندر کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ "اف!" اوپندر نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ "تم لوگ بشریت کے بہترین جذبات کو پاؤں تلے کی مٹی میں ملا رہے ہو اور ان حقیقی چیزوں کو جن کی اساس روح پر قائم ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مادی چیزوں سے ملوث کر رہے ہو۔ آج ......"

لیکن بشیر سے نہ رہا گیا، وہ اپندر کا چیلنج منظور کرتے ہوئے بولا۔ "تو اور کیا محبت تو کیا، دُنیا کی ہر چیز مادیت سے منسلک ہے تم اس حقیقت کو محض ایک جذباتی تقریر سے نہیں جھٹلا سکتے۔ جذبات و حسیات کی دُنیا مادے سے الگ نہیں، بلکہ اسی کی مخلوق ہے، جو چیز گندے گوبر میں مچھر پیدا کرتی ہے وہی چیز مناسب ماحول پا کر تمہارے دماغ کی سلولوں میں محبت بن جاتی ہے۔ انگلز کی کتاب "اینٹی ڈوہرنگ" میں لینن نے بھی یہی لکھا ہے۔"

بشیر جیسا کہ لوگ بہت کم جانتے ہیں بحیرۂ ہند سے اس پار تیسرا صحیح الدماغ اشتراکی ہے اور اس وقت ہندوستان میں پانچویں انٹرنیشنل (مزدوروں کی بین الاقوامی) جماعت کی بنیاد رکھنے میں مصروف ہے، اس لیے جب بھی وہ کلب میں کسی موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ تو سوائے چند ایک سرپھرے ممبروں کے باقی سب اس کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ اور اپندر ان سرپھرے اراکین میں سے ایک ہے۔

"کیا واہیات بات ہے!" ہری نے کہا۔ "محبت یقیناً کوئی آراضی چیز نہیں بلکہ ایک آسمانی جذبہ ہے اور بس، اس کا مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بشیر نے اپنے حکمی نقطۂ نگاہ سے جو نتائج برآمد کیے ہیں، وہ بالکل غلط ہیں۔ مثال کے طور پر اپندر اور کرنا ہی کے تعلقات کو لے لو، یقیناً اوپندر اس بات کا برا نہ مانے گا۔ اگر میں تشریح کے لیے اس کی مثال لے لوں تو اب دیکھیے نا کہ کرنا اپندر سے محبت کرتی ہے، والہانہ محبت! مجھے اس کا اچھی طرح پتہ ہے۔ لیکن یہ محبت ایک روحانی چیز ہے، ایک روحانی کشش جو ان دو دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی ہے۔ کرنا کی محبت میں مادیت کی گنجائش نہیں، وہ ایک امیر لڑکی ہے۔ میرا مطلب ہے کم از کم اس کا باپ تو دولت مند ہے اور اب دیکھیے کہ اس جماعتی تفریق کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اسے اپندر سے عشق ہے۔ اسے اپندر کے مضامین سے عشق ہے۔ یہ عشق یقیناً ایک لافانی کشش ہے۔"

ج۔ س۔ ت نے اپنے حافظہ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "لکھنے والوں اور ان کے مضامین کا ذکر کرتے ہو۔؟ میں اس بات میں ہری سے متفق ہوں۔ محبت ایک روحانی شے ہے۔ عورتیں مردوں سے اس لیے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا امیر و کبیر ہوتے ہیں۔"

"کیا ہندوستان میں عورتیں واقعی محبت کرتی ہیں۔؟" کلب کے ایک زوردار ممبر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ لیکن چوں کہ سوال غیر متعلق تھا۔ اس لیے کسی نے ان کی بات کی طرف توجہ ہی نہ کی۔"

"میں کہہ رہا تھا۔" ج۔ س۔ ت نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا (ج۔ س۔ آج کل اپنا زیادہ وقت نفسیاتی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا ہے) "ہاں میں کہہ رہا تھا، ہاں ٹھیک ٹھیک میں کہہ رہا تھا کہ عورتیں مردوں سے اس لیے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا دولت مند ہوتے ہیں ان کی سعی ناتمام یقیناً ایک روحانی جذبہ کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔ ذرا خیال فرمایئے کہ صالح عورتوں نے محبت کے مسئلہ میں ڈاکٹروں، انجینیروں، ڈپٹی کمشنروں، اور سرمایہ داروں اور دوسرے امیر طبقوں کے افراد کے مقابلے میں غریب ادیبوں، فوج کے سپاہیوں۔ مطبخ کے نوکروں اور فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کو ترجیح دی ہے۔ عورتیں عشق کے مقابلے میں اس مرد کا انتخاب کرتی ہیں جس میں کوئی غیر معمولی خصوصیات ہوں اور درحقیقت عورت کی محبت کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے محبوب کی نظروں میں جگہ پانے کے لیے کوئی غیر معمولی بات کرے۔ ادیب ہو تو ایک کروڑ الفاظ کا ایک بسیط مقالہ لکھے۔ کھلاڑی ہو تو ہاتھ پاؤں بندھوا کر ایک تالاب میں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک تیرنے کی کوشش کرے، سپاہی ہو تو۔"

مجیب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "گھٹنوں کے بل بازار میں چلنے کی کوشش کرے۔"

ج۔ س نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ مرد کوئی ایسی بات ضرور کرے جس سے وہ اپنے محبوب کی نظروں میں غیر معمولی اور مافوق الفطرت معلوم ہو، جیسے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سر کے ارد گرد کوئی روحانی ہالہ سا چمک رہا ہو۔ اب ڈیوک آف ونڈسر کی مثال لیجیے۔ ڈیوک ......"

"لیکن ہم ایک ڈیوک آف ونڈسر یا کرنا کی بات نہیں کر رہے۔"

شیام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈیوک آف ونڈسر وہاں ایک کرنا وہاں کوئی خاص فرق نہیں پیدا کرتے۔ اگرچہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم محبت کا صحیح تجزیہ کریں تو اس تجزیے کے نتائج ان دو غیر معمولی مثالوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوں گے جیسے دوسرے لوگوں کی محبت پر، بات یہ ہے کہ محبت کو آخر کیوں غور و فکر کی نگاہ سے نہ پرکھا جائے اور یہ محبت کا ایک روحانی جذبہ ہونا تو محض ایک طفل تسلی ہے۔ عشق کو مادے کے ماحول میں رکھ کر اسی آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔ جیسے نیوٹن کے قانون حرکت کو یا انسانی جلد پر پسینہ پیدا ہونے کے عملیہ کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ مرد ہمیشہ عورتوں میں ایک حسین چہرہ اور دلکش آداب کے جویا رہتے ہیں۔ اور اگر وہ ہندوستانی ہیں تو ایک گراں قدر جہیز بھی چاہتے ہیں۔ ؟ اور عورتیں ؟ عورتوں کو بھی عشق و محبت کے سلسلہ میں جن خصوصیات کی تلاش ہوتی ہے۔ ان کو روحانیت سے کم لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ لوگ ایک آرام دہ گھر، معقول آمدنی اور "جی حضور" شوہر کو "روحانی چیزیں" کہہ دیں۔ پس عشق کے صحیح نظریے میں روحانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں، عشق کی اساس بھی انسانی زندگی کے دیگر محرکات کی طرح مادے پر قائم ہے اور اسی طرح پرکھی بھی جا سکتی ہے۔ انسان کے مادی ماحول میں تغیر کے تبدل ہونے پر محبت کے نظریے میں بھی مناسب تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف محبت میں بلکہ انسانی زندگی کے تمام سماجی تعلقات اسی ناگزیر تغیر کی وجہ سے تبدیل ہوتے، بنتے، بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے مادی ماحول میں مجنوں کو عشق جتلانے کے لیے صرف ایک اونٹ کی ضرورت تھی، وہ اپنے محبوب کو محمل میں بٹھا کر اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لیے بادیہ پیمائی پر تل جاتا تھا اور اپنے محبوب سے پوچھتا تھا۔

محمل سجا ہوا ہے عزمِ سفر ہے آج!
اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج

لیکن آج کل کے مجنوں کے لیے اونٹ کی ضرورت نہیں اسے تو ایک کار چاہیے۔ اونٹ سے لے کر کار تک محبت کے نظریے میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ نہ صرف انسانی تاریخ کی مختلف منزلوں اور اس کی سماجی اور اقتصادی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ یہ بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں کہ محبت کا عملی نظریہ قرون وسطیٰ کے مادی ماحول سے تبدیل ہوتا ہوا اب خالص سرمایہ دارانہ بن کر رہ گیا ہے اور محبت کے موجودہ اصول اسی اندرونی تضاد اور جماعتی تفریق کے زیر اثر ہیں۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں برسرِ پیکار ہے آج عشق سرمایہ دارانہ اور بورژوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عشق ایک جذبہ نہیں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ محبت آج کل کے مادی ماحول کے زیر اثر ایک محض بورژوا جذبہ ہے، جذبۂ ترحم کی طرح۔!

شیام نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی، جیسے اس نے ایک چٹکی سے اپنے مخالفین کے تمام دلائل کو باطل ثابت کر دیا ہو۔

اب ہر ایک کی نظر سکھو پر گڑی تھی۔ سکھو جو افسانہ نویس تھا وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ محبت کے بارے میں اس کے کیا خیالات تھے کلب کے سارے ممبر یہ جاننے کے لیے بیتاب ہو اٹھے۔ سکھو آج اس تمام بحث کے دوران میں منہ پھلائے ہوئے ایک طرف بیٹھا رہا تھا۔ اب سب کی آنکھیں اپنے چہرے پر لگی دیکھ کر وہ اپنی کرسی پر ایک عجیب بے چینی کے انداز میں ہلا، کسمسایا، اور پھر کہنے لگا۔ میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں ـــــ یہ کہانی ـــــ آپ بیتی ہے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے" سکھو نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے ایک لڑکی سے پہلی نگاہ ہی میں محبت ہو گئی۔ میں نے اس سے خوب تر نسوانی حسن کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا، بس وہ بالکل ریفائل کی اس تصویر کی طرح تھی جسے ہم لوگوں نے پچھلے سال رائل آرٹ کی نمائش میں دیکھا تھا۔ مجھے اس سے والہانہ محبت ہو گئی۔ پہلی نگاہ میں، اور جوں جوں میں اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا میری محبت بڑھتی جاتی تھی، اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر میں پلازہ تھیٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا۔ اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی۔ لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سینما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی تو میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا اور کھیل ختم ہونے تک تو مجھے یقین ہو گیا کہ رب عظیم نے مجھے ایک جاودانی جذبے سے نوازا ہے۔ چنانچہ اس جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاطاً اس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا ......

"یہ ہماری محبت کی ابتدا تھی۔ میں یہ بیان کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے، میری محبت کو کن نازک ترین مراحل سے گزرنا پڑا۔ میں یہ سب باتیں ج۔ س ماہر نفسیات کے تخیلی تجربات کے لیے الگ رکھے دیتا ہوں۔ ہاں صرف اتنا کافی ہے کہ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے، مخلص دوست اس نے کبھی بھی میرے ماں باپ، گھر، بار، میرے سماجی حالات کے متعلق استفسارات نہیں کیے۔ وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی۔ اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں اسے غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کرائے تھے۔ اور میں ہی انھیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرض یہ کہ میں نے فضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری کوشش کی، وہ اس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور میں تو اس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے وہ مجھے اپنے سفر کی حکایتیں سنایا کرتی۔ جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ بلادِ مغرب میں گئی تھی اور میں علم الریاضی میں اپنی جدید تحقیقی و تدقیقی کاوشوں کا ذکر کیا کرتا جن سے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی تکذیب ہوتی تھی۔"

"بہت خوب" ج۔ س نے مزاحاً کہا۔

سکھو چند ثانیوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ آخر کچھ وقفے کے بعد آہستہ سے بولا۔ "کہانی سننا چاہتے ہو یا نہیں۔؟"

ج۔ س نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سوری اولڈ مین" سکھو بولا۔

"ہاں تو اب کہانی میں کیا رکھا ہے۔ میں یقیناً خوش تھا اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لیے خوش رہتا۔ اگر اپندر نے اپنے محبت کے جنسی نظریے سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا۔ پوچھو کیوں؟ اپندر نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو۔ کمبخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے۔!"

"پھر کیا ہوا!" ہم سب نے ایک دم چلا کر کہا۔

"کچھ نہیں" سکھو نے سکون آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "اور سچ بات تو یہ ہے کہ جب میں اس کے مطالعے کے کمرے میں نمودار ہوا۔ تو وہ مجھ سے نہایت ملاطفت سے پیش آئی۔ وہ اس وقت ایک آرام کرسی پر بیٹھی بلند آواز میں ٹینی سن کا کلام پڑھ رہی تھی اور اپنی شیریں نازک اور نقرئی زبان سے خود ہی محظوظ ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"ہلو، بدصو تھانی" وہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی۔

"کرسٹی" میں نے کہا (اور میں اسے اسی طرح بلایا کرتا ہوں)

"ہیل۔۔۔ لو" اس نے پھر حیرانی سے کہا۔ "یہ کیا؟ تم آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے۔!"

میں نے اپنے چہرے پر ایک حزنیہ مسکراہٹ پیدا کر لی۔ اور پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا "پڑھے جاؤ، کرسٹی پڑھے جاؤ میں تمھاری شیریں آواز سننا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح مجھے اپنے آپ میں تحلیل کر لے۔ آہ۔ تمھاری آواز کس قدر شیریں ہے" اس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ چیخ رہی تھی۔ اور تلخ لہجے میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔

کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چیمپین شپ جیت لیا۔ میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت خوب۔ کرزکی نے جواب دیا۔ "کیا تم ایک دیوار کے مقابلے میں کھیل رہے تھے۔

بدحواڈوواتی، مذاق کی حد ہو چکی۔ میں نے جذبات سے گلوگیر لہجہ میں کہا۔ "میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہو چکی۔ کرزکی میری بات سنو، مجھے تم سے محبت ہے بے اندازہ، محبت، کرزکی کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔؟"

وہ چند ثانیے خاموش رہی، پھر اس نے سنجیدہ رو ہو کر پوچھا۔

"تمھارا باپ کیا کام کرتا ہے"؟

"سچی محبت" میں نے جواب دیا۔ "مذہب، نسل اور باپ کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی......"

کرزکی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم ایک مہینہ میں کتنا کما لیتے ہو۔؟"

میں نے احتجاجاً کہا۔ "میں — اشتراکی ہوں۔

"کیا تمھارے پاس ایک کار ہے۔؟"

"کار تو نہیں، لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے، جو مجھے رنجیت سینما کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا۔" میں نے تشریحاً کہہ دیا۔

کرزکی نے جھٹ گھنٹی بجائی، اور اس کا ملازم داؤد کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" کرزکی نے بلند آواز میں کہا، اس کی آواز میں غصہ کے ساتھ عصمت وعفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ "داؤد — اس بدمعاش کو کمرے سے باہر نکال دو۔"

سکھو نے داستان ختم کردی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہو گیا، کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ج۔ س اور اینڈرکسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی استاد کی گھرکی سے بچے دبک کر بیٹھ جائیں آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے۔ یکایک

کلب کے سب سے پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سکھو کے حزیں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا! "بیٹا سکھو، غم کھانے سے کیا ہوتا ہے! انقلاب کے لیے کام کرو۔ اور خدا کا شکر کرو کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود تم زندہ ہو، ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الف لیلہ کی گیارہویں رات

جب پروفیسر رات کے ڈیڑھ بجے سینما (دوسرا شو۔ چارلی، دہشت۔ غوری) دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ حسب معمول بڑے دروازے پر اس کی بیوی اپنے دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ اور مسکرا رہی ہے۔ پروفیسر نے سوچا آج بیوی خوش ہے۔ ہنس کر کہنے لگا۔ آہا۔ میری جان!"

بیوی نے اسے ناک سے پکڑنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر پروفیسر کا کان اس کے ہاتھ میں آگیا۔ چنانچہ اسے زور سے مروڑتے ہوئے بیوی نے نہایت نرم لہجہ میں کہا۔

"میرے پیارے۔" پروفیسر چلایا: "ہائے میں مر گیا۔"

بیوی نے پروفیسر کے سر پر دھپ جماتے ہوئے کہا۔ کس پر مرتے ہو، مجھ پر، کہ مادھوری پر۔ ہائے ما...... مادھوری...... میرا مطلب ہے تم پر۔"

"آؤ۔ میں تمہیں آدمیوں کی طرح مرنا سکھاؤں گی۔" یہ کہہ کر بیوی نے کنڈی لگا دی اور پروفیسر کو کان سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی۔

گو مکان کے دوسرے کمروں میں بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ لیکن جس کمرے میں پروفیسر کو لے جایا گیا وہاں ایک مدھم سی شمع روشن تھی۔ فرش پر بھی سوائے ایک سخت اور کھردری چٹائی کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک کونے میں مٹی کا پیالہ اور ایک طرف ایک بڑے ٹب میں سرسوں کا تیل پڑا ہوا تھا۔ جس میں دو چابکیں تیل میں بھگونے

کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔

"پروفیسر نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس تیل میں کیا ڈبو رکھا ہے؟ یہ تو سانپ سے معلوم ہوتے ہیں۔"

بیوی جھلا کر بولی۔ "ہاں، ہاں، سانپ ہی تو ہیں تمہیں ڈسنے کے لیے، انھیں سانپوں سے تمھاری کھال اتاری جائے گی۔" یہ کہہ کر پروفیسر کی بیوی نے ایک چابک ٹب سے کھینچ لی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی نتھنوں سے آگ کے شعلے سے نکل رہے تھے۔

پروفیسر نے سہم کر کہا۔ "میرے اللہ، یہ تو چابک ہے۔"

" چابک کہنے کے ساتھ ہی "تڑاق" کی آواز کے ساتھ چابک پروفیسر کی گردن اور پیٹھ پر پڑی۔"

خدا کے لیے بیوی مجھے مت مارو، پروفیسر نے چلا کر کہا۔ میں اب کبھی سینما نہیں جاؤں گا۔ "کمینے بدمعاش" پروفیسر کی بیوی نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ آج گیارہ راتیں گزر چکی ہیں۔ تو ہر روز وعدہ کرتا ہے میں سینما نہیں جاؤں گا۔ میں اب سینما نہیں جاؤں گا۔" لیکن سورج ڈوبتے ہی جیسے تجھ پر کوئی جنون سوار ہو جاتا ہے۔ اور تو سینما کا رخ کرتا ہے۔ بدمعاش بتا تیرا کیا علاج ہے۔ میں نے تجھے راتوں بھوکا رکھا، ڈنڈوں سے تجھے پیٹ چکی میں نے تیرے پیٹ پر پتھر بھی رکھائے۔ لیکن تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بتا! اب تجھے کیوں نہ چابک سے ہر رات پیٹا جائے۔

پروفیسر کراہ کر بولا۔ "آہ! چابک والی، چابک والی...... مس نادیا...... پروفیسر کی بیوی تیز تیز لہجہ میں بولی۔ "کم بخت مار کھاتے ہوئے بھی تو فلمی باتیں کیے جاتا ہے تو لڑکوں کو کیا خاک پڑھاتا ہوگا۔" یہ کہہ کر بیوی نے ایک دو اور رسید کیں۔

پروفیسر گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا اور مدھم لہجہ میں بولا۔ "اچھا لگائے جا چابکیں لگائے جا (آہستہ آہستہ گاتے ہوئے) لگائے جا، لگائے جا۔ بے قرار دل لگائے جا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیوی چابکیں لگاتی رہی۔ پروفیسر گانے کی کوشش کرتا رہا آخر۔ جب اس کے ماتھے سے خون نکل آیا تو خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھ کر کہنے لگا۔ میں یقیناً مر جاؤں گا۔ اور پھر تیرا بھی وہی حال ہو گا جو لال دین ملک انتجار کی بیوی کا ہوا۔

"کیا ہوا تھا۔؟" بیوی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

جو غریب فتو کمہار کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی کا حشر ہوا تھا۔

"اور اسے کیا ہوا تھا۔؟" بیوی نے کہا۔

اس کا بھی وہی حال ہوا تھا۔ جو سردار اوتار سنگھ سینیئر سب جج کھائی گلا کے دوست لال گیاسی شاہ کی بیوہ نانی کا ہوا تھا۔

بیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اور وہ قصہ کس طرح ہے۔

وہ واقعہ ایسا ہی ہے جیسا ایک دفعہ مولانا عتیق بابری مشہور قومی کارکن کی تیسری بیوی کو پیش آیا تھا۔

پروفیسر کی بیوی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔" ہائے تم بھی مجھے کچھ نہیں بتاتے اور یوں ہی میری جان ہلاک کر رہے ہو۔ ہائے اب میں کیا کروں"

"چابک ہاتھ سے چھوڑ دو۔" پروفیسر نے مشورہ دیا۔

بیوی نے چابک ٹب میں پھینک دی اور اپنے دونوں بازو پروفیسر کی گردن میں حمائل کر کے اس کے آغوش میں بیٹھ گئی "خدا کے لیے مجھے جلد بتاؤ۔ کہ لال دین ملک انتجار کی بیوی کو کیا ہوا تھا۔ اور فتو کمہار کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی اور سردار اوتار سنگھ ...

پروفیسر نے قطع کلام کر کے درشت لہجہ میں کہا۔ "سنو بیوی میں تمھیں وہ قصہ سناتا ہوں۔

ایک دن مولانا عتیق بابری مشہور قومی کارکن شہر لاہور میں موری دروازے کے باہر ایک لیکچر دینے جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں انھیں فتو کمہار مل گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضور مجھ پر بہت سخت ظلم ہوا۔ ایسا ظلم تو نوشیرواں نے اس بڑھیا کے ساتھ بھی نہیں کیا تھا۔ جو اس کے محل کے قریب رہتی تھی۔

وہ قصہ کس طرح ہے۔؟ پروفیسر کی بیوی نے پوچھا۔

پروفیسر نے کہا۔" عجیب بات ہے۔ یہی سوال مولانا عتیق بابری نے فتو کمہار سے کیا تھا........ (رک کر) تم نے یہ سوال کیوں کیا۔ (بیوی کو شک کی نظروں سے دیکھ کر) کیا تم مولانا عتیق بابری کو جانتی ہو۔؟

"جانے میری پیزار۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟" بیوی نے

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں نے یوں ہی سوال کیا تھا پروفیسر کا لب و لہجہ بے حد ملایم تھا۔ اور اب وہ اپنی بیوی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔

تو جیسا کہ میں نے کہا۔" پروفیسر نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ مولانا عتیق نے پوچھا وہ قصہ کس طرح ہے تو فتو کمہار نے کہا کہ نوشیرواں کے عہد میں اس کے محل کی غربی سمت ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ پیرزال صد سالہ، لیکن نہایت صابر اور خلیق اس کی صحت عمر کے سو سال گزر جانے پر بھی وہ اتنی عمدہ تھی کہ وہ اپنے گھر کا سب کام کاج اپنے ہی ہاتھوں سے کرتی تھی۔ خود چکی میں گندم پیستی۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹتی، آگ جلاتی روٹی پکاتی، سالن بناتی وہ اپنے جھونپڑے میں اکیلی رہتی تھی۔ خدا کو یاد کرتی تھی۔ اور ہمیشہ خوش و خرم رہتی تھی۔ ایک دن اس ملک کے مشہور عادل بادشاہ نوشیرواں کا گزر اس طرف سے ہوا، وہ ٹہلتا ٹہلتا اکیلا بڑھیا کے جھونپڑے کی طرف آنکلا۔ اپنے شاندار محل کے قریب ہی بڑھیا کے اس چھوٹے سے جھونپڑے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اسے غصہ بھی بہت آیا۔ لیکن انصاف پسند طبیعت رکھتا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔ اور غصہ پی کر بولا۔ "اے غریب بڑھیا تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔؟"

بڑھیا نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔!"

نوشیرواں بولا۔ "لیکن یہ جھونپڑا...... بارش کے دنوں میں اور سردیوں کے دنوں میں جب یہاں برف پڑتی ہے....... اے بڑھیا مجھے تجھ پر بہت ترس آتا ہے..... تو میرے محل میں چلی آ۔

بڑھیا بولی، بادشاہ کو اگر ترس نہ آئے تو کسے آئے گا۔ لیکن اے بادشاہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں بہت خوش ہوں، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اللہ کا ہزار شکر ہے۔

کوئی تکلیف نہیں۔؟ بادشاہ نے حیران ہوکر کہا۔ یہ تو کیا کہتی ہے۔ یہ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تیرے بوڑھے جسم کو سردی گرمی سے نہیں بچا سکتا۔ یہاں چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ ہے۔ میں تجھ سے کہتا ہوں۔ تو میرے محل میں چلی آ، وہاں تجھے ہر طرح سے آرام ہوگا۔ اور نوکر چاکر اور کھانے کے لیے انواع و اقسام کی اشیا رہنے کے لیے عمدہ جگہ۔

بڑھیا لالچ میں آگئی اور بادشاہ کے محل میں آگئی۔ بڑھیا کی جھونپڑی مسمار کردی گئی اور اس طرح نوشیرواں کے محل کے غربی کونے میں جو عمارتی نقص تھا وہ دور ہوگیا۔

"پھر کیا ہوا۔" پروفیسر کی بیوی نے مدھم آواز میں پوچھا اسے نیند آرہی تھی۔

اس کے بعد بڑھیا بڑے آرام سے رہی، بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے چنانچہ بڑھیا کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہی دنیا کی تمام نعمتیں ملنے لگیں۔ کچھ دن تو وہ بہت ہی خوش و خرم رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی صحت میں نمایاں کمزوری پیدا ہونے لگی۔ اب وہ ایک چڑچڑی اور کاہل الوجود بڑھیا بن گئی تھی۔ پہلے اسے زکام ہوا۔ پھر کھانسی اور آخر میں نمونیا۔ دس پندرہ روز بیمار رہنے کے بعد وہ بیچاری اپنے جھونپڑے کو یاد کرتی ہوئی اس دنیا سے چل بسی۔

ارے۔؟

ہاں تو اور کیا پروفیسر نے کہا۔ "مرتے وقت اس سے کہا گیا۔ کہ نوشیرواں نے اس کے ساتھ کیسا انصاف کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ مر رہی تھی۔ تو اس نے بادشاہ کو اپنے سامنے بلایا۔ اور بولی۔ "تم نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو ریاست پونچھ کے موچی کے ساتھ کوہ کھوڑی ناڑ کی نیلم پری نے کیا تھا۔"

بادشاہ نے حیران ہوکر پوچھا۔ یہ حکایت کیا ہے۔؟

لیکن پیشتر اس کے کہ بے چاری بڑھیا جواب دیتی فرشتۂ اجل نے اس کی روح قبض کرلی۔

پروفیسر بولا۔ فتو کمہار نے مولانا عتیق بابری کو یہ کہانی سنا کر کہا۔ حضور میرے ساتھ بھی بس اسی طرح ظلم ہوا ہے بات یہ ہوئی کہ میں ——"

مولانا عتیق بابری نے جیب سے گھڑی نکال کر کہا۔ فتو کمہار مجھے اس وقت فرصت نہیں۔ میں ابھی موری دروازے کے باہر ایک تقریر جھاڑنے جا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم کل مجھے بابا حق حق اور چالیس چور کی سرائے میں ملو۔ تو میں تمھاری داستان سن لوں گا اور ٹھہرو سنو اپنے ساتھ ایک پستول ضرور لیتے آنا اور سرائے کے دروازے پر ٹھہر کر تین بار دستک دینا۔ ایک بار تیز اور دو بار ہلکی۔ اس کے بعد ایک حور شمائل تمھارے لیے دروازہ کھول دے گی خبردار اسے دیکھ کر گھبرا نہ جانا۔ وہ تمھیں دیکھ کر تین بار مسکرائے گی ایک بار تیز دو بار ہلکے ہلکے اور پھر تمھارے رخساروں پر تین بوسے دے گی۔ ایک دائیں طرف دو بائیں طرف۔

دو بائیں طرف فتو نے کان کھجلاتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں۔ مولانا عتیق بابری نے نہایت آہستہ سے کہا ان باتوں کو اچھی طرح سے یاد رکھو۔ ان پر تمھاری زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر تم ذرا بھی چوک گئے تو تمھارا بھی وہی حال ہوگا، جو اخبار خلیجی کے اڈیٹر کا مس ریواز کے گھر کے گرد چکر لگانے پر ہوا تھا۔

یہ قصہ ....

سچ .... سچ .... مولانا نے کہا مجھے اس وقت فرصت نہیں بابا حق حق اور چالیس چور کی سرائے میں سب کچھ بتاؤں گا میری بات اچھی طرح سمجھ لو۔ جب وہ حسینہ تمھارے رخساروں پر تین بوسے دے چکے۔ تو تمھیں آگے بڑھ کر اس کے کان میں یہ الفاظ تین بار کہنے ہوں گے۔

اور وہ الفاظ کیا ہیں۔؟"

مولانا نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آہستہ سے فتو کے کان کے قریب منہ لے جاکر کہا۔

"کالا بل۔ کالا بل۔"

کالا بل۔ یہ وہی بل تو نہیں جس کے متعلق اخباروں میں ....!

لیکن مولانا عتیق بابری ایک چھلاوے کی طرح گم ہو چکے تھے۔ بے چارا فتو کمہار اسی طرح حیران و پریشان گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے سردار اوتار سنگھ ملے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے اور انھوں نے چھوٹتے ہی کہا کیوں ہے۔"

پروفیسر کی بیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ اوں اوں ہمیں نیند آرہی ہے۔ باقی کل سہی .... لیکن پہلے یہ وعدہ کرو کہ اب کبھی سینما نہیں جاؤ گے۔

تمھاری قسم اب کبھی نہیں جاؤں گا۔ پروفیسر نے جواب دیا۔

کل تمھیں سردار اوتار سنگھ سینئر سب جج کے دوست لالہ گھاسی شاہ کی نانی کی حکایت سناؤں گا بہت دل چسپ ہے اچھا تو سو رہو اور مجھے تو بھوک لگی ہے۔ دیکھوں شاید کہیں سے کچھ مل جائے۔

یہ کہہ کر پروفیسر اُٹھا اور کمرے کے اس کونے میں گیا جہاں آبخورہ رکھا ہوا تھا۔ کیا دیکھتا ہے، آبخورے کے پاس ہی مٹی کا ایک پیالہ بکری کے دودھ سے لبالب رکھا ہے اور اس میں کھجوریں پڑی ہیں۔

دوسرے دن وہ دن بھر لڑکوں کو پڑھاتا رہا۔ لیکن جب شام کے پانچ بجے وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلا تو اس کے قدم خود بخود سینما گھر کی سڑک کی طرف مڑ گئے اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتے گئے۔ راستے میں اسے ایک آدمی ملا۔ جو گھنٹی بجا بجا کر پکار رہا تھا۔

"بڑے مزے کا کھیل۔ چارلی۔ دیکھشت۔ بلی موریا۔

پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سینما گھر میں جا داخل ہوا۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

آنکھیں

ابھی اس دن کی بات ہے میں اور نریندر سہ پہر کو مال روڈ پر چہل قدمی کے لیے نکلے۔ ایک چلتے چلتے نریندر نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔ دیکھو اس کار کی پُشت پر کیا لکھا ہے؟

"کیا لکھا ہے میں نے درشت لہجہ میں پوچھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نریندر کو غیر متعلق باتیں کرنے کی کتنی بُری عادت ہے۔

"اپنے ہمسائے کی بلی سے محبت کرو۔" کتنا عجیب مقولہ ہے۔ نریندر نے کہا۔

میں نے کہا تمھیں پڑھتے وقت غلطی ہوئی ہوگی، ہمسائے کی بلی نہیں بیوی ہوگی۔

ایک ہی بات ہے۔ نریندر نے جواب دیا۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں کی کھال سمور کی طرح ملایم ہوتی ہے اور پنجے تیز اور جب پیار سے گود میں اٹھالو تو خر خر کرنے لگ جاتی ہے۔

مگر وہ لکھا کہاں ہے۔؟

نریندر نے ہاتھ کے اشارے سے آدھ میل دور ایک کار کی پُشت پر اشارہ کیا جو تیز رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔" وہ دیکھو۔ وہاں۔!"

میں نے مسکرا کر کہا۔ معاف کرنا، مجھے آپ پر دوربین ہونے کا گمان نہیں ہوا۔

لیکن نریندر نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ شیام کیا تم سچ مچ اس فورڈ کی پُشت پر لکھے ہوئے مقولے کو نہیں پڑھ سکتے۔؟ میرے خیال میں تمھاری بینائی میں ضعف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگیا ہے۔ کیا تم نے کسی عینک ساز ....

عینک ساز جائے جہنم میں۔ میں نے تنگ آکر کہا۔ میری آنکھیں بھلی چنگی ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ ....

لیکن نریندر نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ میرے خیال میں یہ سینما دیکھنے کی وجہ سے ہوا۔ اگر تم ہفتے میں چار بار سینما نہ جاتے بلکہ شریف آدمیوں کی طرح صرف ایک بار ایک تصویر دیکھنے پر قناعت کرتے تو......

میں نے قطع کرتے ہوئے کہا۔ میں سینما کا اتنا شائق نہیں کہ جتنے تم خود ہو۔ میں نے ہری داس صرف ایک بار دیکھا تھا اور تم نے چار بار۔ میں نے "علم کا یکہ، المعروف "شوہر کی بھوک ہڑتال" صرف چار بار دیکھا ہے دیکھو سچ سچ ......

نریندر نے کہا صرف پچپن مرتبہ گیا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اس فلم میں ایک گانا بہت پسند ہے۔ "سالا۔ کھائے مکی دانے" میرے خیال میں یہ بہترین ہندوستانی فلم ہے جس میں جنگل کے مناظر اتنے دل فریب دکھائی دیتے ہوں۔ لیکن ان باتوں سے تمہاری بینائی تو درست ہونے سے رہی۔ کیا تم اس سائن بورڈ کو پڑھ سکتے ہو۔ جو اس دوا سازی کی دوکان پر لگا ہے۔

کون سا سائن بورڈ، مجھے تو وہاں کچھ نظر نہیں آتا۔

نریندر ہنسنے لگا۔ ایک طنزیہ، ظالمانہ ہنسی، میرا دل بیٹھنے لگا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں مطمئن نہیں۔ میں اپنی بصارت کھونا نہیں چاہتا۔

نریندر نے کہا آؤ۔ ابھی چلتے ہیں۔ وہ پرے "باوا نرائن سنگھ" ماہر امراض چشم" کی دوکان ہے۔

باوا نرائن سنگھ ماہر امراض چشم سے ملاقات ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک تیز و تلخ قسم کا اشتراکی ہے وہ پہلے دی آئنا میں ایک یہودی ڈاکٹر سے آنکھوں کی بینائی ٹھیک کرنے کا کام سیکھتا تھا۔ پھر جب نازی آئے تو انھوں نے یہودی ڈاکٹر کو

اس بنا پر قید کر لیا کہ وہ لوگوں کی آنکھیں ذرا ضرورت زیادہ درست کر دیتا تھا، اسے نازی کبھی برداشت نہ کر سکے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہودی ڈاکٹر کو برکنسٹیسن کے مقام پر ایک کنکنٹریشن کیمپ میں قید کر دیا اور باوا نرائن کو دی آئنا سے بھاگتے ہی بنی۔

جب باوا نرائن سنگھ اپنے دی آئنا کے قیام کے حالات سُنا رہا تھا تو میں نے اسے ٹوک دیا۔ مجھے سیاسیات عالم پر تبصرہ نہیں چاہیے۔ میں نے کہا مادر میں ہر ہٹلر کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ مجھے دوا چاہیے۔ میں اپنی آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور بس۔

باوا نرائن سنگھ نے ہنستے ہوئے نریندر سے کہا۔ تمہارا دوست ایک دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تم اسے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جب تک تمہاری آنکھیں ہیں تم اپنے آپ کو سیاسیات عالم سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ یہ زندگی کا پہلا اصول ہے۔ میرے خیال میں تمہارے دوست کو ضعف بصارت کا مرض اس لیے بھی ہے کہ اس نے موجودہ تواریخ کا غلط مطالعہ کیا ہے اسے دو عینکوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنی آنکھوں کے لیے اور دوسری اپنے دماغ کے لیے۔

میں نے جھلا کر کہا مجھے عینک لگانے والوں سے سخت نفرت ہے۔

"گاندھی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ باوا نرائن سنگھ نے فوراً پوچھا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس کا لہجہ کتنا غیر مقدس اور بازاری تھا کوئی اشتراکی ہی ایسے الفاظ استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے زک دینے کی ٹھان لی۔

گاندھی کو تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ تو ایک دیوتا ہے۔ میں نے کہا وہ شری رامچندر جی کا اوتار ہے میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ عینک استعمال کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ شاید اس سے سچائی اور اہنسا کے اصولوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ان کی بینائی کمزور ہے۔ میرا اعتقاد ہے کہ مہاتما گاندھی جی عینک کے بغیر بھی ہر چیز کو نہایت صاف اور واضح صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ تمھیں یہ یاد رہے ڈاکٹر کہ میں ایک پکا کانگریسی ہوں۔ اور گاندھی جی کے معجزوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں والہانہ اعتقاد رکھتا ہوں میرے ان چند جملوں نے بے چارے اشتراکی ڈاکٹر کے مونہہ پر مُہر لگا دی۔ غریب کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ آہستہ سے اس نے میری دونوں آنکھوں میں کسی سیال شے کے چند قطرے ٹپکا دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے ایک پُر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ ایک دوا ہے جو تمھارے حلقۂ بصارت کو بڑھا دے گی۔ اس شیشی کو گھر لے جاؤ۔ اور دن میں دو تین بار اس کے چند قطرے اپنی آنکھوں میں ٹپکاتے رہنا۔ تیسرے دن میرے پاس تشریف لے آیئے۔ پھر میں اپنی آنکھوں کا آخری معائنہ کرکے آپ کی عینک کے لیے نمبر تجویز کردوں گا۔ گوڈبائی۔"

اس بے رنگ سیال دوا کے چند قطروں نے مجھ پر آشکارا کردیا کہ بینائی تو محض ایک اضافی شے ہے اور دراصل آنکھوں کی پتلیوں کے قطر پر منحصر ہے۔ پہلے میں خیال کرتا تھا کہ آنکھیں روح کا آئینہ ہیں۔ کہیں دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر دل کے ویرانے میں عجیب سے سائے کانپنے لگ جاتے تھے اور شعری آنکھیں بحری لہروں کی طرح دل کے ساحل پر ٹکرانے لگتی تھیں۔ اب پتہ چلا کہ آنکھیں روح کا آئینہ نہیں ہیں بلکہ محض ایک کیمرہ اور آخر محض ایک معمولی سے کیمرے کے لیے دل کے ویرانے میں کیوں عجیب سے سائے کانپنے لگ جائیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس بیرنگ سیال دوا کے چند قطروں نے اس حقیقت کو مجھ پر آشکارا کیا۔ ان چند قطروں نے میری آنکھوں کی پتلیوں کے قطر کو بڑھا دیا۔ جس سے مجھے دُنیا کی ہر چیز دُھیلی ہوئی اور عجیب سی نظر آنے لگی۔ ساری کائنات ایک سبز اور نیلے رنگوں کے ملے جلے سائے میں کھوئی گئی۔ کہیں کہیں اس میں عجیب عجیب اور نادر رنگوں کے نخلستان سے آباد تھے ایسے نیلے، جیسے کوئی ساکن جھیل اور ایسے نارنجی جیسے غروبِ آفتاب کا پگھلا ہوا سونا۔ سڑکوں پر بجلی کے کھمبے یکا یک بلند ہوتے گئے اور آسمان سے جا ملے وہ ایک ایسی جھلملاتی ہوئی ندی کے پانی

کی طرح چمک رہے تھے۔ جو زمین سے نکل کر جنت کی طرف بہتی جا رہی تھی۔ ایک موہوم سی عجیب شے۔ ایک سُرخ ساڑی پہنے ہوئے میرے پاس سے گزر گئی۔ یکا یک سورج کی کرنوں نے اسے چھو لیا — اور اس کی ساڑھی کا کنارہ ایک شعلے کی طرح بھڑک اُٹھا۔ اور میں نے چلا کر کہا تمھیں آگ لگ گئی ہے۔ اپنے آپ کو بچالو۔ یہ شعلہ اتار کر پھینک دو نیا تپ ایک تانگہ بھاگا جا رہا تھا۔ اور اس کا پائدان ایک ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ یکا یک تانگہ میرے قریب سے گزر گیا اور ستارہ ٹوٹ کر آتش بازی کے پھولوں کی طرح لاکھوں چمکتے ہوئے ذروں میں بکھر گیا۔ وہ روشنی کا ایک فوارہ تھا جو یکا یک تاریکی میں پھوٹا اور اپنے کروڑوں دمکتے ہوئے موتیوں کی تابانی سے نگاہ کو خیرہ کرتا گیا۔ سہ منزلہ مکانوں کی قطاریں قدرے غیر واضح سلسلہ ہائے کوہ کی طرح تھیں۔ آدمی روشنی اور سایوں کے دھندلکے سے نظر آتے تھے۔ اور عورتیں سونے اور نیلم کی جھیلیں۔ اور بازار میں قدم رکھنا الف لیلیٰ کی غیر مرئی اور سحر زدہ کائنات میں داخل ہونا تھا۔

ہاں کبھی کبھی یہ ضروری ہے کہ آدمی سچائی کو پانے کے لیے اپنی آنکھوں کا معائنہ کروالے۔ اپنی بصارت کو درست کرنے کے لیے دنیا کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھ لے یہ چیز ہمیں اضافی نظریئے کی حد تک لے جاتی ہے۔ اور سب چیزوں سے بڑھ کر سچائی کی حیثیت خالصتہً اضافی ہے وہ کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ بلکہ نیلم کے ٹکڑے کی طرح مختلف پہلوؤں سے جھلکتی ہے۔ ایک لمحے میں وہ سُرخ ساڑھی کے زریں فیتے کی طرح چمکتی ہے اور دوسرے لمحے میں شعلے کی طرح بھڑک کر پگھلے ہوئے لاوے کی ندی بن جاتی ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ پوری سچائی نہیں بلکہ سچائی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن جب بے رنگ سیال دوا کے چند قطرے آنکھ کی پتلی کا قطر بڑھا دیں تو آنکھ روشنی زیادہ جذب کرسکتی ہے۔ تانگے کے پائیدان ستارے بن جاتے ہیں۔ عورتیں سونے اور نیلم کی جھیلیں سچائی میں جھوٹ کا انعکاس ہوتا ہے اور عدم تشدد کی ہیئت اختیار کرلیتا ہے۔ زیادہ روشنی جذب کرو۔ گاندھی جی مرن برت رکھتے ہیں اور ہندوستانی رہنما عوام سے طاقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پنت کا کہنا ہے کہ صرف گاندھی جی کی قیادت ہی ہمیں آزادی دلا سکتی ہے۔ قیادت اور طاقت، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ کہ ہمارے گاندھی کی قیادت اسی قدر مفید نہیں کہ جس قدر امرت دھارا کے چند قطرے .....

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

کسان اور دیوتا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب دیوتا ہم انسانوں میں ہی رہتے تھے۔ بولتے چلتے اور کھاتے پیتے تھے۔ اور مصیبت کے وقت لوگوں کو صحیح مشورہ اور نیک صلاح دیتے تھے۔ لوگوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور وہ اپنی عقل فرزانگی کی وجہ سے پوجے جاتے تھے۔ لوگ اپنی ہر تکلیف ان کے پاس لے جاتے تھے۔ کیوں کہ اس زمانے میں انسانوں اور دیوتاؤں میں براہِ راست رابطہ تھا ---!

اس زمانے میں چک ڈھوڈھا کلاں نمبر ۲۱۸ ضلع ہوشیار پور میں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک دیوتا رہتا تھا۔ اس کا نام گُگ گُگ تھا۔ اور وہ اپنے جسم پر راکھ کے بجائے سیندور کی بھبھوت رماتا تھا۔ اور پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے اس کے جسم کا لال رنگ دور دور تک لوگوں کو نظر آتا تھا۔ لوگ باگ اپنی کڑی مصیبت کے وقت اس کے پاس بھاگ کر جاتے۔ سیس نواتے۔ پھول بتاشے پیش کرتے اور دیوتا سے فیضیاب ہوتے آس پاس کے علاقے میں اور بھی دیوتا تھے مگر ان سب میں سب سے زیادہ گُگ گُگ ہی مشہور تھا۔ اور لوگ سب سے زیادہ اس کے پاس جاتے تھے۔

اس زمانے میں چک ڈھوڈھا کلاں نمبر ۲۱۸ ضلع ہوشیار پور میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ وہ نہ صرف دھن دولت کے اعتبار سے غریب تھا۔ بلکہ مزاج کا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے حد غریب ہمیشہ سر جھکا کے چلتا۔ عاجزی سے بات کرتا اور اپنے بڑوں کا ادب کرتا۔ آج تک کسی نے اس کے مُنہ سے ایک گالی نہ سُنی تھی۔ گو گاؤں میں اس کی زمین سب سے کم تھی۔ اور بیلوں کی ایک ہی جوڑی اس کے پاس تھی۔ اور اس کا چھپّر سب سے چھوٹا تھا۔ تو بھی کسی نے کلمۂ شکر کے سوا اس کے مُنہ سے کچھ اور نہ سُنا۔ کیوں کہ وہ بڑا محنتی اور نیک دل کسان تھا۔ اور اپنی چھوٹی سی باڑی۔ اپنے چھوٹے سے گھر اور اپنی پیاری بیوی اور بچّوں میں مگن تھا۔ گج گج دیوتا اس سے بہت خوش تھا۔ اور لوگوں کو تلقین کرتے وقت اکثر اس کی مثال دیا کرتا۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ وہی غریب کسان ایک تپتی دوپہر میں پریشان حال گھبرایا ہوا دیوتا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"مہاراج مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ شمال کی جانب سے ایک ٹڈّی دل آیا اور میرے کھیتوں میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹڈّی دل کسی دوسرے کسان کے کھیت میں نہیں بیٹھا۔ صرف میرے کھیتوں میں بیٹھا اور میری ساری ہری بھری فصل اجاڑ گیا۔ اور پھر اُڑ کر چلا گیا۔ مہاراج میں لوٹ گیا۔ اُجڑ گیا۔ برباد ہو گیا۔ اب میں اور میرے بیوی بچے اگلے چھ ماہ تک کہاں سے کھائیں گے۔؟"

دیر تک گج گج نے کسان کی فریاد سُن کر اپنی آنکھ کھولی اور مراقبے سے جاگ کر کہا۔

"جب ٹڈّی دل فصل کھا کر اُڑتا جا رہا تھا۔ کیا تو نے اس وقت آسمان کے بادلوں کو دیکھا۔ جو اپنے سینے میں نئی فصل کی نوید لے کر آتے ہیں۔؟"

کسان لاجواب ہو گیا اور دیوتا کے پاؤں چھو کر چلا گیا۔

ایک سال بعد کسان پھر اپنے بال نوچتا ہوا دیوتا کے سامنے ہاتھ باندھے آکھڑا ہوا۔ اور دل شکستہ لہجہ میں بولا۔

"گج گج دیوتا۔ ندی میں باڑھ آگئی۔ کسی کا چھپّر ٹوٹا۔ کسی کا بیل ڈوب گیا۔ مگر میرے تو تینوں کھیتوں کو بہا کر لے گئی۔ مہاراج میرے پاس دھان کے وہی تین کھیت تھے۔

جنھیں باڑھ بہا کر لے گئی۔ اب میرے بچّے ایک ایک دانے کو ترسیں گے۔!"

دیوتا بولے۔

"جو چاول نہیں اُگا سکتے۔ وہ مکّا، جوار اور گندم اُگاتے ہیں اور اسی سے دونوں وقت پیٹ بھر کر شکر کرتے ہیں۔"

دیوتا کی بات سن کر کسان خاموش ہو گیا۔ اور سر جُھکا کر واپس چلا گیا۔

دو سال بعد کسان کے دونوں بچّے ہیضے سے وفات پا گئے۔ ایک لڑکا تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ دونوں کی لاشیں اپنے سینے سے لگائے زار و قطار روتا ہوا دیوتا کے حضور میں آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"میرے دونوں بچّے مر گئے۔ میرے دونوں بچّے مر گئے بھگوان کے لیے ان کو زندہ کر دو۔!"

گج گج دیوتا نے کہا۔

"جو مر جاتے ہیں وہ کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ موت سب پر لازم ہے۔ اسی لیے بالآخر موت کے غم کو سب بھول جاتے ہیں۔"

"ہائے میں لاوارث ہو گیا گج گج دیوتا۔" کسان روتے ہوئے بولا "میرے دونوں بچّے مر گئے۔!"

گج گج دیوتا نے کڑی نظروں سے کسان کی طرف دیکھا۔ اور بولے۔

"بھری برسات میں تو بنجر سے بنجر زمین پر پھول کھلتے ہیں اور تیری بیوی تو جوان ہے۔ خوبصورت ہے اور کوکھ والی ہے۔؟"

دیوتا کے جواب نے کسان کو چُپ کرا دیا۔ اس کے دل کی تسلّی نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنے بچّوں کی لاشیں سینے سے لگائے واپس چلا گیا۔

مگر چھ ماہ بعد ہی پھر لوٹ آیا اور آتے ہی دیوتا کے قدموں میں لیٹ گیا۔ اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"کیا ہے۔؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیوتا نے اس سے پوچھا۔

"میری بیوی! " کسان اپنے آنسوؤں سے تر بتر رخسار دیوتا کے پاؤں سے ملتے ہوئے بولا۔

"میری بیوی بھی مر گئی۔ پہلے میری فصل گئی۔ پھر میرے کھیت گئے۔ پھر میرے بچے گئے۔ اور آج میری بیوی بھی چل بسی۔ میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ دیوتا۔! اب میں کیا کروں۔؟

دیوتا دیر تک چپ رہے۔ ان کے پرانے خاموش چہرے پر غرور و فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ پھر ہوتے ہوتے ان کے چہرے پر ایک الوہی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بڑے نرم سنجیدہ اور ہمدردی بھرے لہجہ میں بولا۔

"جب تو اپنی بیوی کی چتا جلا کے واپس آ رہا تھا تو کیا تو نے گھاٹ کے کنارے جوہی کے پھول دیکھے تھے۔؟"

"ہاں دیکھے تھے۔" کسان نے جواب دیا۔ مگر جوہی کے پھولوں کا میری بیوی سے کیا واسطہ۔!"

دیوتا نے اسے سمجھایا۔

"جہاں چتا جلتی ہے۔ وہاں جوہی کے پھول بھی ہوتے ہیں۔"

مگر کسان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنی بیوی کی موت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مضبوطی سے اپنے دیوتا کے پاؤں پکڑ لیے اور غم و غصہ سے بے تاب ہو کر وحشتناک آواز میں بولا۔

"مگر مہاراج وہ میری بیوی تھی۔ بیوی! میرے دل کا آخری سہارا۔ آج وہ آخری سہارا بھی جاتا رہا دیوتا۔!"

دیوتا نے جواب میں پھر کہا۔

"اور جب تو چتا جلا کر واپس اپنے گھر جا رہا تھا۔ تو کیا تو نے راستہ میں گاؤں کے کنوئیں پر کنواریوں کو پانی بھرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں کا نرم لہجہ، ان کی

میٹھی باتوں کی خوشبو، ان کے خدوخال کی روپہلی گونج کیا تجھے یاد نہیں۔؟"

دیوتا چپ ہو گئے۔ کسان نے دیر تک دیوتا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن جب دیوتا کے منہ سے کچھ اور نہ نکلا تو وہ دیوانا وار روتا ہوا دیوتا کے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے لپک کر دیوتا کو گردن سے پکڑ لیا۔ اور اس کا زور سے پیپل کے پیڑ سے ٹکرا دیا۔ دیوتا کے ماتھے سے خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ اور وہ خوف سے چلا یا۔

"ہائے میرا سر پھٹ گیا۔"

کسان نے کہا "سر پھٹ گیا تو کیا ہوا۔ وہ دیکھو آسمان پہ ابابیلیں اڑی جا رہی ہیں۔!"

اور یہ کہہ کر کسان نے گج گج دیوتا کے جبڑے پر دو گھونسے مارے۔

"ہائے ہائے میرے دانت ٹوٹ گئے۔!" گج گج دیوتا درد سے بیتاب ہو کر چلایا۔

"دانت ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔" کسان دانت پیس کر بولا۔ "وہ دیکھو پیپل کے پرے تالاب کے کنارے کیسے کیسے سندر پھول کھلے ہیں۔؟"

اور یہ کہہ کر کسان نے دیوتا کا بازو موڑ کر اسے کسی درخت کی شاخ کی طرح توڑ دیا۔

دیوتا چیخ کر بولا۔

"ہائے میرا بازو ٹوٹ گیا۔"

"بازو ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔" کسان غیظ و غضب میں جھلا کر بولا۔ "شکر کرو کہ تم اندھے نہیں ہو۔؟"

اس دن سے بھگوان نے طے کیا ہے کہ سب دیوتا پتھر کے ہوں گے۔ اور منہ سے کچھ نہیں بولیں گے۔!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوائی قلعے

"ہوائی قلعے" کا موضوع وہی ہے جو ہندوستانی میں "خیالی پلاؤ" ہندوستان کی مثالی "بھوک" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے یہ ایک محدود سی اصطلاح ہے۔ جس کا مرجع محض "پیٹ" ہے۔ لیکن "ہوائی قلعے" ایک بلند اور وسیع ترین اصطلاح ہے اور اس میں نہ صرف خیالی پلاؤ بلکہ کئی ایک دلکش چیزیں بھی شامل ہیں کہ جن کے وجود سے ہندوستان ابھی تک ناآشنا ہے۔ ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے "خیالی پلاؤ" میں "ہوائی قلعے" انھیں سُنا سکتے۔ لیکن ہوائی قلعے میں بیٹھ کر "خیالی پلاؤ" پکائے جاسکتے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس لحاظ سے سارا ہندوستان ایک "ہوائی قلعہ" معلوم ہوتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی "ہوائی قلعے" بنائے ہیں؟ میں بچپن کی بات نہیں کرتا جب ساری زندگی ہی ایک ہوائی قلعہ معلوم ہوتی ہے ماں کی گود میں جا بیٹھے اور پھر اونگھتے اونگھتے ایک دم پھر سے چڑیا بن کر باغ میں سیب کے سفید سفید پھولوں پر جا بیٹھے اور وہاں سے چونچ نکال کر ماں کو ڈرانے لگے، دیکھو، دیکھو، اماں میں کتنی اونچی جگہ بیٹھا ہوں۔

اور اماں ہنس کر پڑوسن سے کہتی۔ "کس قدر بھولا ہے، نادان میری گود میں بیٹھا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بہت اونچی جگہ بیٹھا ہوں۔" اس کے بعد

تمہیں پیار سے تھپک کر کہتی ہیں "سو جاؤ میرے ننھے۔"

—— اور تمہارا ہوائی قلعہ ٹوٹ جاتا ہے۔

یا یوں کہ رینگتے رینگتے آنگن میں چلے گئے۔ دیوار کے ساتھ تین اینٹیں لگا لیں، ایک تو ہے کالا کوا، وہ دیو سا جانور جو منڈیر پر بیٹھ کر اپنی خوفناک آواز میں چلّایا کرتا ہے۔ اور جو کبھی تمہیں اکیلا پاکر تمہارے ننھے منّے ہاتھوں سے بسکٹ چھین لیا کرتا۔ دوسری اینٹ بے شک تمہاری بڑی بہن ہے جو تمہیں ہر وقت چومنے پر مصر رہتی ہے۔ جو تمہیں میٹھی بھی لگتی ہے اور تلخ بھی۔ میٹھی اس وقت جب کھلیتے کھلاتے، ہنستے ہنساتے تمہیں ایک بار زور سے گلے سے لگا لیتی ہے اور تمہیں عجیب عجیب پیارے پیارے ناموں سے بلاتی ہے اور تلخ اس وقت جب وہ تمہیں نہلانے کے لیے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتی ہے یقیناً تمہیں پانی پسند نہیں، آخر تم ایک خشکی پر چلنے والے جانور ہو نہ کہ پانی کی مچھلی اور پھر وہ صابن کا نمکین جھاگ جو ناک کے نازک نتھنوں میں، آنکھ کے پپوٹوں کے اندر پہنچ کر مرچیں سی لگا دیتا ہے —— ! پھر کس سختی سے وہ ایک کھردرا تولیہ لے کر تمہارے چھوٹے سے جسم کو صاف کرتی ہے حتیٰ کہ تمہارا سارا جسم لال ہو جاتا ہے۔ اور اس عمل کے دوران میں وہ برابر گنگناتے جاتی ہے۔ کوئی بے معنی گیت۔ اور پھر کوئی تھوڑا سا خوشبودار تیل لے کر تمہارے چھوٹے سے سر پر اس زور سے مالش کرتی ہے کہ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ نازک سا سر ٹوٹ جائے گا مگر یہ بھی تم برداشت کر لیتے ہو۔ لیکن وہ اس پر بھی بس نہیں کرتی بلکہ لکڑی کی ایک خاردار چپٹی سی لے کر وہ اسے بار بار تمہارے گھنگھریالے بالوں میں پھیرتی ہے حتیٰ کہ درد کی شدت سے تم بلبلا اُٹھتے ہو اور حیران ہوتے ہو کہ وہ میری میٹھی بہن کہاں گئی اور یہ کون ہے۔ جسے مجھے رلانے میں مزا آتا ہے۔

تیسری اینٹ تمہارا سب سے بڑا بھائی ہے، وہ تمہیں شاذ ہی دکھائی دیتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکثر اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب ہوتی ہے اور آنکھوں پر ایک موٹی سی عینک، وہ تمھیں اس وقت پیار کرتا ہے جب تم بالکل اکیلے ہوتے ہو۔ پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ تم اکیلے ہو نا اور پھر تم دل ہی دل میں حیران ہو رہے ہوتے ہو کہ یہ میرا اتنا اونچا بھائی کیا کر رہا ہے اور اس کی آنکھوں پر وہ دو گول گول سی چیزیں کیا چمک رہی ہیں کہ وہ تمھیں یکا یک زمین سے اتنا اونچا اٹھا لے جاتا ہے۔ گویا تم آسمان سے جا لگے ہو۔ وہ تمھیں ہوا میں پھینک دیتا ہے۔ بہت اوپر کہ تم یکایک ڈر جاتے ہو۔ پھر وہ باہیں پھیلا کر تمھیں جھٹ آغوش میں لے لیتا ہے۔ کہ تم خوشی سے ہنسنے لگتے ہو۔ تمھیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی ہنسنے لگ جاتا ہے۔ وہ تمھیں گدگداتا ہے اور تم زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہو۔ جس پر وہ تم سے بھی زیادہ زور زور سے قہقہے لگاتا ہے اس شور وغل کو سُن کر گھر کے چار پانچ افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں، خالہ، اماں، باورچن، بڑی بہن اور اس کی آیا۔ پھر وہ سب بڑے بھائی پر ہنستے ہیں اور بڑا بھائی شرمندہ سا ہو کر تمھیں جھٹ زمین پر اُتار دیتا ہے۔ اور بھاگ کر اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔

اب ان تین اینٹوں ہی سے تم دن بھر کھیلتے ہو تم بڑے بھائی کی عینک اُتار لیتے ہو اور اسے ایک گائے بنا کر بہن کی چوٹی سے باندھ دیتے ہو۔ تم بڑی بہن کو صابن کے جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتے ہو۔ وہ چیختی ہے تم خوش ہوتے اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو۔ آنگن میں ایک طرف کونے میں بیٹھی ہوئی اماں تمھیں دیکھ دیکھ کر مُسکراتی ہیں اور پھر تکلی پر سوت چڑھا کر اسے گھماتی ہیں۔ اتنے میں وہ چپٹی اینٹ جسے تم کُتا سمجھتے ہو، تمھارے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے جاتی ہے۔ اور تم غصے میں اٹھا کر اسے دیوار سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیتے ہو اور بسورنے لگ جاتے ہو۔

اور اماں پوچھتی ہیں۔ ”اوں اوں کرتے ہو۔ ابھی تو ہنس رہے تھے۔؟“

نہیں، نہیں۔ ماں میں بچپن کے ہوائی قلعوں کی بات نہیں کرتا۔ میں تم سے لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کے ہوائی قلعوں کا حال پوچھتا ہوں۔ کیا لڑکپن کی شرارتوں میں بھی تم نے بچپن کے پُرانے کھیل کا اعادہ کیا ہے، بچپن کی زندگی تو ایک مسلسل حیرانی کی زندگی تھی۔ ابا جان کے حقّے سے لے کر کوئیں کی پہلی چڑیا تک ہر چیز حسین نظر آتی تھی۔ تم ایک مٹی کی گڑیا میں جان ڈال دیتے تھے، ایک لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر تمام دُنیا کی سیر کر آتے تھے ایک کاغذ کی ناؤ میں بیٹھ کر سات سمندر پار چلے جاتے تھے۔ لیکن کیا لڑکپن میں تم اپنے اس پُرانے محبوب کھیل کو بھول گئے تھے۔ سچ کہنا، تم نے اپنے شریر تخیل کی مدد سے کتنی بار سکول کی عمارت کو آگ لگا دی ہے حتیٰ کہ اس کے شعلے آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔ کتنی بار اس موٹے ٹھنگنے اُستاد کو کہ جو تمھیں تاریخ پڑھاتے وقت تمھارے بازوؤں میں زور زور کی چٹکیاں لیا کرتا ہے، ایک اونچے کھجور کے درخت کے ساتھ اس طرح اُلٹا لٹکا دیا کہ دُنیا بھر کی تمام کوشش اسے نیچے اُتارنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اور پھر سکول کے سب اُستاد ہیڈ ماسٹر سمیت (اور یہاں تم مسکراتے ہو) تمھارے پاؤں پڑتے ہیں اور تم ایک دم اُچھل کر اس اونچی کھجور کی آخری پھننگ پر پہنچ جاتے ہو اور اپنے اُستاد کو چشم زدن میں نیچے اُتار لاتے ہو اور پھر وہ عمر بھر تم سے تاریخ کے سوال نہیں پوچھتا۔

یکا یک تمھیں ہوش آ جاتا ہے۔ اور تمھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تم اسی ٹھنگنے تاریخ پڑھانے والے استاد کے عین سامنے بنچ پر جماعت میں بیٹھے ہو۔ اس نے غالباً تم سے کوئی سوال پوچھا مگر تم اس کا جواب دینے سے قاصر ہو۔ کیسے دے سکو گے جب کہ تم ایک دل خوش کن ہوائی قلعہ بنانے میں مصروف تھے کہ جس میں ایک کھجور کے درخت پر تم نے اسی استاد کو اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نے کیا سوال کیا ہے، تم لازماً خاموش رہ جاتے ہو۔
پھر وہ تمھارے بازوؤں میں چٹکیاں لیتا ہے۔

یا پھر ورزش کے میدان میں کھیلتے کھیلتے تمھیں یکایک احساس ہوتا ہے کہ تم سکول کے سب سے اعلیٰ کھلاڑی بن گئے ہو۔ تم ہاکی کھیل رہے ہو اور مخالف ٹیم پر گول پہ گول کر رہے ہو چاروں طرف شامیانے لگے ہیں اور لوگ تمھیں دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اب آدھا وقت ختم ہو چکا ہے اور تمھیں چائے اور رنگترے، آڑو اور کیک پیش کیے جا رہے ہیں، تمھارا ہیڈ ماسٹر تمھیں شاباش کہتا ہے۔ یکایک سیٹی بجتی ہے اور اب تم ہاتھ میں کرکٹ کا ایک بلا لیے جا رہے ہو اور وکٹ پہ پہنچ کر خوب زور سے لگاتے ہو، وہ مارا گیند آسمان کی طرف اچھلتی ہوئی میدان کو پار کر جاتی ہے اور لکڑی کے اس بڑے سے تختے پر جو میدان کے باہر لگا ہے، تمھارے نمبر کے آگے "چھ" کا ہندسہ لگ جاتا ہے اور تمھارے دوست حیران ہوتے ہیں۔ چھ! ارے ایک ہٹ میں چھ! توبہ یہ لڑکا بھی ایک آفت ہے، ارے یہ تو چھپا رستم نکلا (اور یہاں تمھارے لبوں پہ مسکراہٹ آجاتی ہے) اور تم اس طرح ہٹ پر ہٹ لگاتے ہو کہ مخالف ٹیم میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور تم لڑکوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ——

ایں یہ کیا؟ یہ گیند کدھر چلی گئی، یہ شور و غل کیسا؟ یہ کپتان کیوں مجھ پر خفا ہو رہا ہے؟

اور اب تمھیں شرمندگی سے احساس ہوتا ہے کہ جب تم گول پر کھڑے اپنے تخیل کی زریں دنیا میں کھیل رہے تھے۔ یکایک گیند تمھاری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر کر گول کو پار کر گئی۔

کیا تم سو رہے تھے؟ (کپتان تم سے خفا ہو کر پوچھتا ہے)
تم سر جھکا لیتے ہو اور تمھارا ہوائی قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔

یا پھر یوں ہوتا ہے کہ تمھارا امتحان ہو چکا ہے اور نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اور تم اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہو اور یقین کر لیتے ہو کہ تم ہر مضمون ہی میں بلکہ ہر جماعت

میں اول نکلتے ہو، آٹھویں سے نویں نویں سے دسویں، ایف، اے، بی، اے، ہر جماعت میں وظیفہ حاصل کرتے ہو۔ اس کے بعد آئی، سی، ایس، یا اپنے شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس، وردی پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار، لوگ چاروں طرف سے سلام کر رہے ہیں اور تمھاری دستار کا سفید براق طرہ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ گھر پہنچتے ہو تو بینڈ بجتا ہے، والد فرطِ مسرت سے گلے لگا لیتے ہیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا دبلا پتلا لڑکا جو تمھاری جماعت میں تم سے اول رہا کرتا تھا۔ اب تمھیں کیسی حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

مگر دوسرے دن جب نتیجہ نکلتا ہے تو تمھارے ہر ہم جماعت کو پتہ چل جاتا ہے کہ تم محض اپنے والد کے اثر و رسوخ سے پاس ہوئے ہو۔

آہ تم سے جوانی کے ہوائی قلعوں کا حال کیوں کر پوچھوں میں پوچھتا ہوں وہ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ سیپ کے موتیوں کی طرح، کتنے نازک ہوتے ہیں پانی کے شفاف بلبلوں کی طرح کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ محبوب کی نگاہوں کی طرح ان کی پینگیں تمھیں عرش کی بلندیوں پر لے جاتی ہیں اور دوسرے لمحے میں زمین پر اگی ہوئی حقیر گھاس کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ وہ دل میں سوئے ہوئے نغموں کو بیدار کر دیتے ہیں، جذبات کے دبے ہوئے سوتوں کو ابلتے ہوئے چشموں کی صورت میں بہا دیتے ہیں اور لرزتی ہوئی ناکام حسرتوں کو بجلیاں بنا دیتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ تم خار دار میدان میں اپنے بے ہوش محبوب کو اٹھائے ہوئے چل رہے ہو، ہر قدم پر ایک نیا کانٹا تمھارے پاؤں میں چبھ جاتا ہے اور ایک نیا گھاؤ پیدا کر دیتا ہے۔ مگر تم ہو کہ پروا نہیں کرتے، سامنے آگ کا دریا ہے، تم اس میں سے بھی گزر جاتے ہو تمھارے بال جھلس گئے ہیں، جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں، مگر تم اپنے محبوب کو اپنے دل میں چھپائے صحیح و سلامت صاف بچائے جاتے ہو، اب ٹھنڈی ہوا ایک خوشنما چمن ہے، پھولوں کی روش پر ایک مرمریں مسہری میں تم اپنے محبوب کو لٹا دیتے ہو، پھر تمھیں ایک سانپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈس لیتا ہے۔ محبوب کو ہوش آجاتا ہے۔ اور تم اسے دیکھتے ہوئے مرجاتے ہو۔
جوانی کے ہوائی قلعے کتنے عجیب ہوتے ہیں اور بچپن اور لڑکپن کے زریں عہدوں کی یادگار رہتے تھے۔ مگر ناسازگاری زمانہ سے جوانی میں آکر معدوم ہو گئے، وہ بچپن کا ساتھی۔ گلی ڈنڈا کھیلنے والا ہمجولی جس کے ساتھ بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق ہوائی قلعے تعمیر کیے تھے وہ آج کہاں ہیں۔؟ بچپن سے لڑکپن تک وہ ساتھ دیتا آیا۔ اب یکا یک عنفوانِ شباب میں کیوں اس دُنیا سے رُوٹھ گیا۔ اور یکایک سارے قلعوں کو مسمار کر گیا۔ وہ الھڑ نیلی لڑکی جس سے بڑے چاؤ چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ موٹ بیاہ رچایا تھا۔ کیوں عین شباب کی سرمستیوں میں ایک بالکل انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن کر چلی گئی اور تمھارے کلیجے میں ناسور پیدا کر گئی، ہاں! جوانی میں آدمی بہت سے پرانے ہوائی قلعوں کو ٹوٹتا دیکھتا ہے اور ان کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اس کے بچپنے کی معصومیت اور لڑکپن کی شوخی اور شرارت بھی رخصت ہوتی جاتی ہے۔

لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو بچشم پُرنم خیرباد کہی وہاں تم نے بہت سے نئے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی، تم نے اپنی سانولی محبوبہ کو رنگت کی چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا، اپنی گری ہوئی پسماندہ قوم کو یکایک دُنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتور قوموں کے زمرے میں بٹھا دیا، اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کر دیا کہ کائنات کی کُل وسعتیں اس کے سائے تلے آگئیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا اور اپنے کیریکٹر کو اتنا سنوارا کہ نوعِ انسان نے متفقہ ووٹ سے تمھیں اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ تم دُنیا کے سب سے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نویس، سیاست دان سپاہی، حکیم، اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمھارے سر پر رکھا گیا!

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمھاری آنکھ اس وقت کھلی۔ جب تم ایک

حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے ایک حقیر سے مشاہرے پر ملازم ہوئے۔ تمھارے ماں باپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور تمھارے پلّے ایک چڑچڑی اور بے حد وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبّت کے سوتے خشک ہو گئے پھونس کے جھونپڑے جل گئے، اور تمھارے مُلک و قوم غریب تر ہوتے گئے۔

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے جوانی کے بعد پیری آئی۔ اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے اپنے لیے کچھ باقی نہیں، اب توجہ دوسروں کی طرف ہے بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لیے، بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑوں کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اپسرائیں ناچ رہی ہیں، اس کے خوب صُورت داماد نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دُنیا بھر کے گھٹنیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے کیوں کہ دادا خود گھٹنیا کا مریض اور وہ خود ڈاکٹر کو فیس دیتے دیتے تنگ آگئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں، ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں، وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گھٹنیا کی وجہ سے ناچ نہیں سکتے۔ وہ گانا چاہتے ہیں، مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے۔ رُسنا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، یا روشنی ہی روشنی، یا پانی ہی پانی۔ پھر انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں۔ سکڑتے ہوئے۔ سمٹتے ہوئے صرف ایک وزن بن کر رہ گئے ہیں۔ اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرّہ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن، پانی کی پتلی سی لہر۔ ● اسی طرح ہوائی قلعے بناتے ہوئے زندگی گزر جاتی ہے۔

☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے ایک حقیر سے مشاہرے پر ملازم ہوئے ۔ تمھارے ماں باپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور تمھارے پلے ایک چڑ چڑی اور بے حد وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبت کے سوتے خشک ہو گئے پھونس کے جھونپڑے جل گئے، اور تمھارے مُلک وقوم غریب تر ہوتے گئے۔

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے جوانی کے بعد پیری آئی ۔ اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے اپنے لیے کچھ باقی نہیں ، اب توجہ دوسروں کی طرف ہے بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لیے ۔ بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑوں کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اپسرائیں ناچ رہی ہیں ، اس کے خوب صورت داماد نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دُنیا بھر کے گھنٹیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے کیوں کہ دادا خود گھنٹیا کا مرض اور وہ خود ڈاکٹر کو فیس فیس دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں ، ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں ، وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گھنٹھیا کی وجہ سے ناچ نہیں سکتے ۔ وہ گانا چاہتے ہیں مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے ۔ سُننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکا یک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ، یا روشنی ہی روشنی ، یا پانی ہی پانی ۔ پھر انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں ۔ سُکڑتے ہوئے ۔ سمٹتے ہوئے صرف ایک وزن بن کر رہ گئے ہیں ۔ اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرہ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن ، پانی کی پتلی سی لہر۔ • اسی طرح ہوائی قلعے بناتے ہوئے زندگی گزر جاتی ہے۔

☆☆

کرشن چندر کی متین اور شستہ ظرافت سے بھی نقاد قائل ہیں ۔ فراخ کی ملکی ملکی چاشنی طنز یہ انداز نگارش اور افسانوی تخیل ان کی تحریر اور اسلوب بیان کے خاص لوازم ہیں ۔ وہ ایک جدت طراز ادیب ہیں مفکرین ۔ جو کچھ لکھتے ہیں اس کو دل کی گہرائیوں سے سوچتے ہیں اور اسے بیان کرتے ہیں ۔ ان مضامین میں آپ کو جہاں انشائے لطیف کے نہایت نفیس نمونے ملیں گے وہاں ان کی افسانوی دلکشی سے بھی محظوظ ہوں گے ۔

عرض ناشر ۔ ہوائی قلعے

ASIA PUBLISHERS